تبیان المسائل

دس اہم مسائل



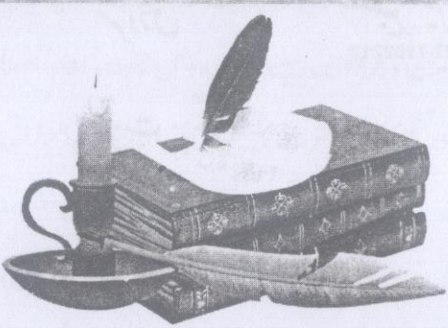
تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

مجلس علماء اہلسنت
وادیٔ بناہ کھوئی رٹہ آزاد کشمیر

تبیان المسائل

دس اہم مسائل



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

نام کتاب	تبیان المسائل
تحقیق	محقق دوراں قاضی محمد عظیم نقشبندی فاروقی
سال اشاعت	شعبان المعظم، ۱۴۳۹، بمطابق ۲۰۱۸
کمپوزنگ	صغیر احمد قادری
سرورق	شبیر حسین 0322-7202212
قیمت	روپے

رابطہ نمبر 0344-5751600, 0301-5802417

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

بحضور، مظہر ولایت، رہبر شریعت، مبلغ اہل سنت، جامع طریقت وحقیقت حضرت خواجہ پیر محمد ریاض نقشبندی اسلمی سجادہ نشین سادہ شریف جہلم،

جن کی نگاہ کرم، تربیت باطنیہ، اور فیوض ولایت کی برسات سے وادی بناہ کا ایک نوجوان ''عبدالرزاق'' شریعت وطریقت کی منازل طے کرتا ہوا خلافت ظاہریہ اور باطنیہ کے منصب پر فائز ہوا،، اور اس کا وجود مسعود اہل سنت و جماعت کیلئے چشمہء فیض ثابت ہوا، ''مسائل تسعہ، (نومسائل)'' کا یہ مجموعہ اپنے وجود اور تشہیر میں حضرت پیر خلیفہ مجاز الحاج عبدالرزاق صاحب آف بھروٹ گالہ کا مرہون منت ہے، یہ مجموعہ مسائل للّٰہیت کی بنیاد پر عقیدہ اہل سنت و جماعت کی تائید وتوثیق کیلئے معرض وجود میں آیا ہے، اللہ وحدہ لاشریک اپنے نبی، رسول اور محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہء جلیلہ سے شرف قبولیت عطا فرمائے، اور بارگاہ ایزدی سے ملنے والے ثواب کو خلیفہ مجاز پیر الحاج عبدالرزاق صاحب کے والدین مرحومین کو ایصال کرتے ہیں، اللہ قبول ومنظور فرمائے، آمین

بندۂ گنہگار قاضی محمد عظیم نقشبندی فاروقی عفی عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارا موضوع ہے اذان برقبر

اہل سنت و جماعت، مشروعیت کے قائل ہیں دیو بندی، وہابی، غیر مقلد بدعت، گمراہی اور دخول جہنم کا ذریعہ قرار دیکر منع کرتے ہیں، غوری صاحب نے اپنے مسلک کے مطابق اذان برقبر کو بدعت اور گمراہی کا راستہ قرار دیا ہے، اور اپنے مسلک کی صحت پر حدیث "فان الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و شر الامور محدثاتھا و کل محدثۃ بدعۃ و کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار" سے استدلال کیا ہے،،

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکمیل ایمان کا جز اور صحت اعتقاد و عمل میں لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے کسی مومن کیلیئے اتباع رسول سے مجال انکار اور راہ فرار ممکن نہیں، حدیث مذکورہ بالا واجب الاتباع ہے، اس میں ذرہ بھر بھی شائبہ وہم و گمان نہیں مگر مخالفین جس تعبیر و تشریح کے ذریعے جائز اور مشروع کاموں کو بدعت، حرام، ناجائز کہہ کر لوگوں کو عمل کرنے سے منع کرتے ہیں وہ محل نظر ہے،،

معترضین کا خیال ہے کہ مطلقاً ہر نئی چیز بدعت ہے اور گمراہی ہے، مولانا غوری نے کتابچہ کے ص،۲۸ پر یہی نقل کیا ہے مانعین اذان برقبر کے نزدیک ہر نئی چیز دین میں بدعت ہے اور گمراہی ہے داخل فی النار ہے، غوری صاحب پر لازم تھا کہ وہ پہلے بدعت کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کرتے، تاکہ قارئین حدیث مذکورہ بالا کے معنی اور مفہوم کو باوضوح سمجھ سکتے،،

ملاحظہ فرمایئے محدثات محدثۃ کی جمع ہے اور محدثۃ مصدر ہے، اصطلاح شریعت میں محدثۃ اس شیء کا نام ہے جس کا ثبوت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اجماع امت سے نہ مل سکے (المنجد) حدیث کے پہلے جملے شر الامور محدثاتھا کا معنی یہ ہے کہ برے کام وہ ہیں جن کا ثبوت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اجماع امت سے نہ ملتا ہو، اور ایسا ہر کام بدعت ہے یعنی بدعت وہ

کام ہے جس کا ثبوت کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے نہ ملے اور جس کام کی اصل سند اور ثبوت ان ادلہ شرعیہ ثلثہ سے نہ مل رہا ہو، وہ سراسر گمراہی ہے چونکہ امور بدعت یہی تین چیزیں ہیں جن میں دو کا ذکر خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے آپ کا دور وحی اور نزول قرآن کا دور ہے اس لئے اجماع امت کی ضرورت نہ تھی، ذکر نہ کرنے کی وجہ بھی یہی ہے امام ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں تحریر فرمایا کہ: "انما سماها بدعة لان ما فعل ابتداء بدعة سيئة وليس كذالک بدعة شرعية، فان البدعة الشرعية التى ضلالة مافعل بغير دليل شرعى"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک امام کے پیچھے نماز تراویح پڑھنے کو جو بدعت فرمایا ہے وہ تقوی کے اعتبار سے ہے وہ بدعت شرعیہ نہیں تھی کیونکہ شریعت نے اس بدعت کو گمراہی کہا ہے جو بغیر دلیل شرعی کے معرض وجود میں لائی جائے،،

امام ابن تیمیہ کی تقریر سے معلوم ہوا کہ بدعت کا لغوی معنی نئی چیز ہے شریعت میں ہر نئی چیز بدعت ضلالہ نہیں، بلکہ وہ بدعت گمراہی تصور ہوگی جس کے قیام اور وجود پر کوئی دلیل شرعی نہ ہو، دلیل شرعی کیا ہے؟ کتاب وسنت اور اجماع امت،،

معترضین کا مطلقاً ہر نئی چیز کو بدعت سیہ کہنا گمراہی قرار دینا لغت اور اصطلاح کے منافی ہے،

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے بدعت سیہ کی تعریف میں فرمایا کہ: "ما احدث مما يخالف الكتاب او السنة او الاثر او الاجماع فهو ضلالة" وہ امر جو کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم یا اثر صحابی یا اجماع امت کے خلاف ہو وہ گمراہی ہے،،

امام شافعی علیہ الرحمہ کی توضیح سے عیاں ہوا کہ علی الاطلاق ہر نئی چیز بدعت ضلالت نہیں بلکہ وہ نئی چیز بدعت سیہ ہوگی جو کتاب وسنت، آثار صحابہ، یا اجماع امت کی مخالفت میں معرض وجود میں لائی گئی ہے فرمایا: "وما احدث من الخير مما لا يخالف شيئا من ذالک فليس بمذموم" (مرقات

اور وہ امر جدید جو اچھا ہو اور مذکورہ اشیاء میں سے کسی کی مخالفت نہ کرتا ہو تو وہ بدعت سیہ نہیں،، امام شافعی مجتہد فی الشرع ہیں، قرآن وسنت کی تفہیمات میں ان کا مقام محتاج تعارف نہیں، آپ نے بھی علی الاطلاق بدعت کو گمراہی قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ شرعی اعتبار سے بدعت سیہ ءوہ نئی چیز ہے جو کتاب وسنت، آثار صحابہ یا اجماع امت کے معارض اور مخالف کے طور پر معرض وجود میں آئی ہو، اور اگر ان امور میں سے کسی کے مخالف اور کسی کے معارض نہ ہو تو وہ بدعت حسنہ ہے گویا امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک شریعت کی رو سے بدعت دو قسم کی ہیں، بدعت سیہ ء اور بدعت حسنہ،، تفریق کیے بغیر ہر بدعت کو سیہ ء اور ضلالت کہنا بذات خود بدعت سیہ ء اور ضلالت ہے ،معترض نے فقط معنی لغوی کے لحاظ سے بدوں تفریق کیے، بدعت حسنہ کو بھی امر ضلالہ کی بھٹی میں جھونک دیا ہے، قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ معترض کا موقف شریعت کے مطابق ہے یا امام شافعی کا ؟ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بدعت ضلالہ کیا ہے :" والمعنی ان من احدث فی الاسلام رایا لم یکن له من الکتاب او السنة مسند ظاهر او خفی ملفوظ او مستنبط فهو مردود علیه" (مرقات)

اسلام میں جو شخص ایسی رائے ایجاد کرے، کتاب وسنت سے دلیل ظاہری یا خفی، لفظا اجتہاد سے اس کی تائید، یا ثبوت مہیا نہ ہو رہا ہو تو وہ بدعت ضلالة ہے،،

عبارت کا مفہوم اور ملا علی قاری کا موقف بالکل واضح ہے یعنی جس نئے کام کا ثبوت کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ظاہری یا خفی، لفظی یا اجتہادی دلیل سے نہ ملے وہ بدعت ضلالة ہے ظاہری دلیل سے مراد نص ہے، استنباط سے مراد اجتہاد ہے،،

بدعت ضلالة کیلئے ضروری ہے کہ اس کی تائید کتاب وسنت اور اجتہاد سے بھی نہ ہوتی ہو اور جس امر جدید کا ثبوت قرآن وسنت یا استنباط سے ہوتا ہو وہ بدعت ضلالة ہرگز نہیں، اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتی ہے، ارشاد فرمایا کہ:

"ماراه المسلمون حسنا فهو عند اللہ حسن "(مرقات) جس امر جدید کو علمائے امت کار حسن سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی حسن ہی ہے،،

اس حدیث سے عیاں ہوا کہ امر جدید کے حسن یا مذموم ہونے کا حکم علمائے راسخین جاری کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ توحید کے سائے میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور اور تفقہ فی الدین کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے علمائے راسخین فی العلم نے بدعت حسنہ اور بدعت مذمومہ کی تفریق اور تقسیم کیے بغیر علی الاطاق بدعت کو ضلالۃ اور داخل فی النار نہیں کہا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور مزید تصریحات بعد میں آرہی ہیں،

معترضین بدوں تحقیق بدعت کا معنی نئی چیز لے کر امور حسنہ کو بھی مذموم، ضلالت اور داخل فی النار کہہ دیتے ہیں جو سراسر دین میں مداخلت، مسلمانوں کے ساتھ زیادتی اور علمائے امت بلکہ مذکورہ بالا فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صریحاً خلاف ورزی ہے،

دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ :"من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها، وجمع ابوبكر وعمر القرآن و كتبه زيد فی المصحف وجدد فی عهد عثمان رضی اللہ عنهم "(مرقات)

جس شخص نے اسلام میں کسی اچھے طریقے کو ایجاد کیا اس کو اس کا اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے اس کا اجر بھی اس کو دیا جائے گا ،دیکھیے حضرت ابوبکر صدیق ،حضرت عمر فاروق، رضی اللہ عنہما نے اجزائے قرآن پاک کو جمع کیا اور حضرت زید رضی اللدعنہ نے اس کو صحیفہ کی شکل دی ،حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں اسی نسخہ کی تجدید کی گئی ،اور سرکاری طور پر پورے ملک میں پھیلا دیا گیا، جو آج تک من وعن تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے اور قیامت تک باقی رہے گا،،

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے اہل علم صاحب الرائے افراد کے کار

حسن ایجاد کرنے پر بے پناہ ثواب کی بشارت دی ہے، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہر نئی چیز گمراہی اور امور مذمومہ کے دائرہ میں نہیں آتی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ اقدس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر اجزائے قرآن پورے ملک سے منگوائے گئے، صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی نگرانی میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب وحی نے اجزائے قرآن کو یکجا کر کے صحیفہ کی شکل دی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تدوین کا مشورہ دیا تو وہ چونک پڑے اور کہنے لگے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیوں کروں؟ ظاہر ہے وہ کام نیا تھا، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا وجود ثابت نہ تھا مگر حضرت عمر فاروق نے اس نئے کام کو ھذا واللہ خیر کہا اور بعد میں جب حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت زید کو بلوایا، کتابت قرآن کا حکم دیا تو، انہوں نے بھی یہی کہا جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا وہ آپ کیسے کرینگے؟ فرمایا: ''وھو واللہ خیر'' اگر نیا کام مذموم، امر ضلالتہ اور داخل فی النار ہوتا تو حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس نئے کام کو قسم کھا کر کار خیر کیوں فرماتے؟ جبکہ وہ خود اپنی زبان مبارک سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسی تدوین شدہ نسخہ کی تجدید کی اور سرکاری طور پر پورے ملک میں پھیلا دیا جو آج تک چلا آرہا ہے، اگر ہر نئی چیز بدوں تمیز، بدعت مذمومہ یعنی گمراہی ہوتی تو غور کیجیے اس قول شنیع کے مطابق کتنی صدیاں اور کتنے مسلمان بدعت مذمومہ کی زد میں چلے آرہے ہیں، کیا آج کے صحرانوردوں کو مفہوم بدعت سمجھ میں آیا ہے؟ مخالفین نے بدعت کی جو تعریف کی ہے وہ حضرت عثمان غنی کے جمع قرآن کتابت قرآن پر صادق آتی ہے یا نہیں؟ اگر صادق آتی ہے تو خلفائے راشدین مھدیین کیلئے کیا حکم ہے؟ نعوذ باللہ اگر ان کا عمل بدعت ضلالۃ ہے اور وہ خود بدعتی ہو کر جہنمی ہیں نعوذ باللہ من ذلک، کیا حدیث مذکورہ بالا کا عموم اطلاق ان کیلئے نہیں؟ اگر نہیں تو وجہ ممانعت کیا ہے؟ مانع

اخلاق دلیل عقلی ہے یا نقلی؟ وضاحت مطلوب ہے،

امام ابن حجر عسقلانی نے فرمایا! بدعت ضلالۃ یہ ہے کہ:" والبدعة اصلها ما احدث على غير مثال سابق و تطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتكون مذمومة" (فتح الباری)

یعنی اس امر کی کوئی مثال پہلے شریعت میں کسی بھی لحاظ سے موجود نہ ہو، شریعت میں بدعت ضلالۃ وہ ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل وجود میں آئے، اگر سنت کے مقابل اور مخالف ہو تو وہ بدعت مذمومہ ہے،،

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا فرمان اس بات پر نص ہے کہ ہر نئی ایجاد بدعت سیہء یعنی بدعت مذمومہ نہیں بلکہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معارض اور مقابل جو نئی چیز وضع ہو وہ بدعت مذمومہ اور بدعت ضلالۃ ہے، اور اگر اس طرح اور اس نہج پر نہ ہو تو وہ بدعت مذمومہ نہیں، اگر اس کی بنیادوں میں خیر و حسن شامل ہو تو وہ امر جدید بدعت حسنہ ہوگا، اسی عنوان کے تحت علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا!" وهی اعتقاد خلاف المعروف من الرسول لا بمعاندة بل بنوع شبهة" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو طریقہ معروف اور مشہور ہو اس کے خلاف عقیدہ رکھنا بدعت مذمومہ ہے، شرط یہ ہے کہ یہ اعتقادی اختلاف کسی شبہ کی بناء پر ہو، عناد کی وجہ سے نہ ہو، اگر بر بنائے عناد ہو تو وہ کفر صریح ہے،،

علامہ شامی کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ بدعت سیہء اور بدعت ضلالۃ کا وجود اس بات پر معلق اور مشروط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی قول معروف اور عمل متواتر کی مخالفت ہو اور یہ مخالفت عقیدتاً کی گئی ہو،

مولف نے اپنے کتابچہ عنوانی "اذان بر قبر اہل سنت کی نظر میں" اذان بر قبر کو بدعت مذمومہ، بدعت ضلالۃ کہا ہے، جب کہ یہ قول اس بات کا تقاضا کر رہا ہے، کہ اذان بر قبر کے مذموم اور گمراہی ہونے کیلئے اذان بر قبر کی ممانعت پر واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول، فعل موجود ہو

اوراس کی مخالفت کی وجہ سے اذان برقبر بدعت مذمومہ اور گمراہی ہو، جب اذان برقبر کی ممانعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول اور کوئی فعل نہیں تو اذان برقبر کو کس بنیاد پر بدعت مذمومہ، امر ضلالت کہنا صحیح ہے؟ امام ابن حجر عسقلانی بدعت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تحقیق یہ ہے: "والتحقیق انها ان کانت مما تندرج تحت مستحسن فی الشرع فهی مستحن فی الشرع فان کانت مستقبحة والا هی من قسم المباح وقد تنقسم الی الاحکام الخمسة" (فتح الباری جلد چہارم، ص، ۲۵۳)

تحقیق یہ ہے کہ اگر نیا کام شرعی لحاظ سے امور حسنہ میں داخل ہوتو وہ بدعت حسنہ ہے اور اگر شرعی طور پر افعال مذمومہ میں داخل ہوتو وہ بدعت قبیحہ یعنی بدعت مذمومہ ہے اور اگر حسن وقبح کا علم نہ ہوتو وہ نیا کام مباح ہے، احکام شرعیہ کے لحاظ سے بدعت پانچ قسم کی ہے،،

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ ہر نیا کام بدعت نہیں بلکہ شریعت کے تحت اس کے حسن اور قبح کو دیکھا جائے گا شرعی طور ہر اگر وہ نیا کام باعث خیر اور موجب حسنات ہوتو بدعت حسنہ ہے اور اگر معصیت اور برائی کا باعث ہوتو وہ نیا کام بدعت ضلالۃ بدعت مذمومہ ہے اور اگر اچھائی برائی کا کوئی پہلو نظر شرعی سے واضح نہ ہوتو اس نئے کام کا کرنا مباح ہے، شرعی احکامات، شرعی تفصیلات کے مطابق بدعت یعنی نیا کام پانچ حیثیات کا حامل ہے جن کا ذکر بعد میں آرہا ہے،،

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی جامع الاصول کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ: "الابتداع من المخلوقین ان کان فی خلاف ما امر اللہ تعالیٰ به و رسوله صلی اللہ علیه وآله وسلم فهو فی حیز الذم والانکار، وان کان واقعا تحت عموم ماندب اللہ تعالیٰ الیه وحض علیه او رسوله صلی اللہ علیه وآله وسلم فهو فی حیز المدح وان لم یکن مثاله موجودا کنوع من الجود والسخاء وفعل المعروف ویعضد ذالک قول عمر ابن الخطاب فی صلوة التراویح نعمت البدعة

ھذہ" (روح المعانی جز ۱۴، ص، ۱۹۲، ۱۹۳)

مخلوق کی طرف سے جدت طرازی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی مخالفت میں ہوتو وہ لائق مذمت اور قابل انکار ہے، اور اگر ان امور کے تحت ہو جن کی طرف اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترغیب اور تحریص دلائی ہے تو اس امر کا کرنا قابل تعریف ہے، اگرچہ اس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ ہو، مثلاً جود وسخا اور دیگر نیکی کے کام ہمارے اس موقف کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان نعمت البدعت ہذہ سے ہوتی ہے،،

صاحب جامع الاصول کی تقریر سے واضح ہو گیا کہ ہر نئی چیز ہر نئے کام کو بدعت مذمومہ کہہ دینا اور گمراہی قرار دینا غلط ہے کیونکہ دیکھا جائے کہ آیا اس نئے کام کے کرنے سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات کی خلاف ورزی تو نہیں ہوگی؟ اگر احکامات خداوندی اور فرمودات نبویہ کی مخالفت ہوتی ہو تو پھر اس کو کر دیا جائے تو یہ بدعت مذمومہ اور بدعت ضلالہ ہوگی اور اگر اس نئے کام کے کرنے پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات کی مخالفت لازم نہ آتی ہو تو اس کام کا کرنا قابل تعریف ہوگا یعنی اس پر فاعل اجر وثواب کا مستحق ہوگا اگرچہ اس نئے کام کی پہلے مثال موجود نہ ہو صاحب جامع الاصول نے مثالیں دے کر مزید روشن کر دیا کہ مثلاً جود اور سخاوت ہے، اس کی حتمی کوئی مثال پہلے موجود نہیں مگر جب بھی ہوگی جتنی کی جائے گی قابل تعریف اور باعث ثواب ہوگی، اسی طرح فعل معروف ہے نیکی کے کاموں پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کا حکم دیا ہے، کتنی نیکی کی جائے کب کی جائے اس کی کوئی حتمی اور واضح مثال پہلے موجود نہ ہے لہٰذا ایسے نئے امور جو احکام الٰہیہ کے منافی اور فرمودات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف نہ ہوں، ان کا کرنا امر حسن قابل تعریف اور باعث اجر وثواب ہے اگرچہ پہلے ان کی کوئی مثال موجود نہ ہو، مانعین اذان برقبر، یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ، تابعین، تبع تابعین سے اذان برقبر کی کوئی مثال موجود نہیں لہٰذا

بدعت ہے، ان کا یہ کہنا صاحب جامع الاصول کے بیان کئے گئے ضابطہ اور کلیہ کے مطابق غلط ہے، جس طرح جود وسخا اور ہیں اسی طرح اذان ایک ذکر ہے بلند پایہ اللہ کا ذکر ہے، اوقات نماز کے علاوہ بھی فعل معروف ہے اگرچہ اس کی مثال اور اس کا وجود نہ ملتا ہو مزید کل محدثۃ بدعۃ اور کل بدعۃ ضلالۃ (الحدیث) دو موجبہ کلیے ہیں، دونوں جگہ لفظ کل وارد ہوا ہے، علمائے فنون کے نزدیک کل تین قسم ہے اور فقہاء و محدثین کے نزدیک کل مدخول کے لحاظ سے دو قسم ہے، علمائے فنون کے ہاں تین اقسام ہیں: (۱) کلی (۲) مجموعی (۳) استغراقی،، فقہاء کے نزدیک دو قسم اسطرح ہے، (۱) افرادی (۲) مجموعی، چنانچہ علامہ ابن عابدین الشامی فرماتے ہیں: ”لان الغالب فی کل عند عدم القرینۃ انہا اذادخلت علی منکر افادت استغراق الافراد ، واذا ادخل علی معرف افادت استغراق الا جزاء لھذا یقال کل رمان ماکول ,ولا یقال کل الرمان ماکول لان قشرہ لایؤ کل“

کہ جب لفظ کل کے افرادی یا مجموعی ہونے پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر کلیہ یہ ہے کہ اگر لفظ کل اسم نکرہ پر داخل ہے تو مفید استغراق ہوگا یعنی حکم کل کے مدخول کے ہر ہر فرد کو شامل ہوگا اور جب یہ معرف بالام پر داخل ہو جیسا یوں کہا جائے کہ کل الرمان ماکول، تو اب حکم رمان کے اجزاء کی طرف لوٹ آئیگا، کل رمان ماکول کہنا درست ہے مگر کل الرمان ماکول کہنا درست نہیں کیونکہ انار تو کھانے والی شیئے ہے مگر انار کی ہر ہر شے کھانے والی نہیں، انار چھلکے اور دانوں کا مجموعہ ہے دانے کھائے جاتے ہیں مگر چھلکا کھایا نہیں جاتا،،

علامہ شامی کے بیان کردہ ”کل محدثۃ بدعۃ اور کل بدعۃ ضلالۃ میں لفظ کل محدثۃ اور بدعۃ پر داخل ہے دونوں نکرہ ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کل افرادی ہے یا مجموعی اگر افرادی ہو تو ہر ہر فرد مدخول کیلئے بدعت کو ثابت کریگا خواہ وہ بدعت امر ضلالت ہو یا بدعت حسنہ، ایسی صورت میں ہر نئی چیز بدوں امتیاز حسن و قبح امر ضلالہ ہوگی یہ معنی اور یہ حکم احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اقوال

فقہاء اور محدثین کی روشنی میں غلط ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نعمت البدعۃ ہذا بھی بدعت ضلالہ کے زمرہ میں آئے گا، دور صدیقی اور دور عثمانی (رضی اللہ عنہما) میں تدوین قرآن اور کتابت قرآن بھی بدعت ضلالہ کی صف میں آئے گا، فقہاء اور محدثین نے بدعت کی تعریف اور اقسام کے ضمن میں بدعت حسنہ کی جو پانچ اقسام بیان فرمائی ہیں وہ بھی بدعات ضلالہ کا ایک ذخیرہ کہلائے گا، فقہائے متاخرین نے مغرب کے علاوہ بقیہ نمازوں کیلئے جو طریقہ تثویب وضع کیا ہے وہ بھی امر ضلالت قرار پائے گا، جمعہ کے دن خطبہ کی اذان خطیب و منبر کے سامنے پھر لاؤڈ سپیکر کا استعمال سب کے سب بدعات اور امور ضلالہ ہونگے، جبکہ محدثین اور فقہاء ملت نے ان کو بدعات حسنہ قرار دیا ہے، جو موجب خیر وحسنات ہیں معلوم ہوا کل بدعۃ میں مطلقاً بدعت اور بدعت کا ہر ہر فرد مراد نہیں ورنہ مذکورہ بالا خرابی لازم آئے گی، کل کے افرادی استغراقی نہ ہونے پر نقلی قرائن صادقہ موجود ہیں اور وہ احادیث مبارکہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''ماراہ المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن'' جس امر جدید کو میری امت کے علماء حسن قرار دیں وہ اللہ کے ہاں بھی حسن ہے، دوسری حدیث میں فرمایا: ''من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا'' جس نے اسلام میں اچھے طریقے کا ایجاد کیا اس کو اس کا اجر دیا جائیگا،، فقہاء اور محدثین نے بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیءہ کی طرف تقسیم فرمایا اور پھر بدعت حسنہ کو پانچ اقسام میں تقسیم فرمایا، مذکورہ بالا امور کو بدعۃ حسنہ قرار دیتے ہوئے باعث اجر و ثواب بتایا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں جملہ امور حسنہ ہیں مذمومہ یا امور ضلالہ نہیں ،علمائے امت کا امور حسنہ ہونے پر قطعاً اتفاق نہ ہوتا امر ضلالہ پر علماء کا اتفاق محال شرعی ہے ،کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امر ضلالہ پر عدم اتفاق کی ضمانت ارشاد فرمائی ہے ارشاد فرمایا: ''لا یجتمع امتی علی الضلالۃ'' میری امت کے علماء امر ضلالہ کے اپنانے پر کبھی مجتمع نہیں ہونگے ،واضح ہوا کہ حدیث کل محدثۃ بدعۃ میں کل مجموعی ہے افرادی نہیں،، ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے

نقل کیا: ”قال فی الاذهار کل بدعة سیئة ضلالة“ (مرقات)

کہ ”کتاب اذہار“ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ حدیث کل بدعۃ ضلالۃ اپنے عموم پر نہیں بلکہ عام مخصوص ہے، بدعت کی صفت سیء یہاں مقدر ہے اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہر بدعت سیء ضلالت ہے، بدعت سیء پر علماء کا مجموعی اتفاق محال شرعی ہے واضح ہوا کہ حدیث کل محدثۃ بدعۃ اور کل بدعۃ ضلالتہ میں کل افرادی، استغراقی نہیں بلکہ مجموعی ہے، اور حکم ضلالت البدعۃ العامتہ پر نہیں بلکہ مخصوص افراد کیلئے ہے جو بدعت سیء کے تحت داخل اور مفہوم ضلالت میں شامل ہیں، امام نووی شارح مسلم شریف نے بدعت کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ”البدعته کل شیء عمل غیر“ مثال سابق یعنی ہر وہ چیز جس کے عمل پر پہلے کوئی مثال موجود نہ ہو یہ بدعت کا لغوی معنی ہے مولف کتابچہ نے حدیث کے ٹکڑے ”کل محدثۃ بدعتہ“ کا ترجمہ کیا ہے، ہرنئی چیز دین میں بدعت ہے، یہ معنی کرنا غلط ہے، جیسا کہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، ملا علی قاری نے بدعت کا شرعی معنی نقل کرتے ہوئے فرمایا: ”وفی الشرع احداث مالم یکن فی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ والہ وسلم“ کہ بدعت کا شرعی معنی یہ ہے کہ ایسی چیز کا پیدا کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں نہ تھی ہر دو تعریفات سے عیاں ہوا کہ بدعت کا معنی نئی چیز نہیں بلکہ وہ شے ہے جس کے عمل اور وجود پر پہلے کوئی مثال دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود نہ ہو لہذا مولف کتابچہ نے صفحہ ۲۸ پر بدعت کا معنی نئی چیز جو تحریر کیا ہے وہ غلط ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے ضلالتہ کے متعلق فرمایا کہ بدعت دو قسم ہیں، بدعت ضلالتہ اور بدعت حسنہ“

”ما احدث مما یخالف الکتاب واالسنة او الاثر او الاجماع فهو ضلالة وما احدث من الخیر مما لا یخالف شیئا من ذالک“ (مرقات)

جو نیا امر کتاب، سنت، اثر صحابی یا اجماع امت کے خلاف ہو وہ بدعت ضلالتہ ہے اور جو ان میں سے کسی کے مخالف نہ ہو امر خیر ہو، وہ مذموم نہیں یعنی وہ بدعت حسنہ ہے“

امام شافعی رحمہ اللہ کی تصریح اور تعریف اس بات پر گواہ ہے کہ حدیث کل بدعۃ ضلالۃ اپنے ظاہری عموم پر نہیں بلکہ حدیث میں جس نئے امر کی ایجاد کو ضلالۃ کہا گیا اس سے مراد وہ امر ہے جو کتاب وسنت، اثر صحابی یا اجماع امت کے خلاف ہو لہٰذا ہر نئے کام کو بدعت کے درجے میں اتار کر ضلالۃ قرار دینا آئمہ مجتہدین فقہاء اور محدثین بلکہ الفاظ حدیث کے بھی مخالف ہے، مذکورہ بالا ان حضرات کی تصریحات کے خلاف قول، اور فعل کرنے والا جماعت اہل سنت سے نہیں، کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ امام شافعی، امام ابن حجر عسقلانی، امام بدرالدین عینی، امام نووی، علامہ ملا علی قاری اور علامہ ابن عابدین شامی، علامہ محمود آلوسی رحمہم اللہ تعالیٰ کو بدعت کا مفہوم، اور مصداق معلوم نہ تھا، کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان حضرات نے حدیث کل بدعۃ ضلالۃ کا مفہوم اور مراد نہیں سمجھا، اذان بر قبر کی ممانعت پر حدیث زیر بحث کو پیش کرنے والوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ علم کا لفظ کتنے معانی پر اطلاق کیا جاتا ہے، علم کی تعریف کیا ہے؟ علم لغوی لحاظ سے بسیط ہے یا مرکب ہے اس کے اجزائے ترکیبیہ کیا ہیں؟ معقولات عشرہ میں سے علم کس مقولہ کے تحت داخل ہے؟ علم تصور کو کہا جاتا ہے یا تصدیق کو؟ اگر تصور ہے تو بدیہی ہے یا نظری فکری، اگر تصور بدیہی ہے تو تصور ساذج ہے یا تصور معہ الحکم، وہبی ہے یا کسبی، معلوم اور مصداق کے لحاظ سے کلی متواطی ہے یا مشکک؟

بہر حال حدیث زیر بحث کا مفہوم اور مصداق وہ نہیں جو مولف کتابچہ نے سمجھا اور تحریر کیا ہے، اور نہ ہی محدثہ اور بدعت وہ چیز ہے جو مولف موصوف نے سپرد قلم کی ہے، بلکہ محدثہ اور بدعت کی تعریف، مفہوم اور مصداق وہی ہے جو علمائے امت کی تصریحات سے پہلے بیان ہو چکا ہے، فقہاء اور محدثین نے بدعت حسنہ کی پانچ اقسام بیان فرمائی ہیں، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی تصنیف القواعد کے آخر میں تحریر فرمایا کہ: ''البدعة اما واجبة كتعليم النحو لفهم كلام الله ورسوله و كتدوين اصول الفقه و الكلام فى الجرح والتعديل، اما محرمة

کمذهب الجبرية و القدرية ،والمرجئه و المجسمة اما مندوبة کا احداث الرباط ،وقيام المدارس و کل احسان لم يعهد فی الصدر الاول و کالتراويح ای بالجماعة العامة والکلام فی دقائق الصوفية ،واما مکروهة کزخرف المساجد وتزيين المصاحف يعنی عند الشافعية ،اما مباحة، عقيب الصبح و العصر، عند الشافعية ايضاً والا عند الحنفية مکروه و التوسع فی الذائذ الماکل، والمشارب والمساکن"

بدعت حسنہ یا واجب ہوگی جیسے کلام اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سمجھنے کیلئے علم نحو کی تعلیم حاصل کرنا، اصول فقہ کی تدوین، جرح اور تعدیل میں علم کلام کا حاصل کرنا، یا بدعت محرمہ ہوگی جیسے جبریہ، قدریہ، مرجیہ، اور مجسمہ کا مذہب اختیار کرنا، یا بدعت مستحب ہوگی، جیسے مسافر خانوں کی تعمیر، مدارس کا قیام، اور ہر نیک کام جو صدر اول میں نہ تھا اور جیسے جماعت عامہ کے ساتھ نماز تراویح پڑھنا، صوفیاء کے دقائق میں بحث و مباحثہ کرنا، یا بدعت مکروہہ ہوگی جیسے مساجد کی آرائش اور قرآن حکیم کا بناؤ سنگھار، یہ شافعی حضرات کے نزدیک بدعت مکروہہ ہے، یا بدعت مباحہ ہوگی جیسے صبح اور عصر کے بعد نمازیوں کا مصافحہ کرنا، حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے، مگر شافعیہ کے نزدیک بدعت مباح ہے، اور کھانوں، مشروبات میں توسیع لذت پیدا کرنا اور رہائش گاہوں کو وسعت دینا بھی بدعت مباحہ ہے،

بدعت کی ان اقسام کو جلیل القدر محدثین جن میں امام ابن حجر عسقلانی، امام بدر الدین عینی، امام نووی، ملا علی قاری، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، علامہ ابن عابدین الشامی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی شہرہ آفاق تصانیف میں ذکر کیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر بدعت گمراہی نہیں بلکہ بدعت سیۂ گمراہی ہے، صدیوں سے مسلمان قرآن وحدیث سمجھنے کی خاطر صرف ونحو، کی تعلیم حاصل کرتے چلے آرہے ہیں، ان علوم پر علماء نے بڑی بڑی ضخیم کتب تحریر فرمائیں، حواشی لکھے گئے اور لازمی مضامین قرار دیتے ہوئے شامل نصاب کیا گیا، درسگاہوں میں آج بھی کلام اللہ اور کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کیلئے طلباء کو ترجیحی بنیادوں پر ان علوم کی تعلیم دی جاتی ہے فقہی مسائل کی اہمیت، افادیت اور حقیقت معلوم کرنے کیلئے اصول فقہ مدون ہوئی، جس میں ادلہ شرعیہ کی توضیح، وجہ علت ودلیل ہونا، اوران کی بنیاد پر مسائل کا استخراج اور استنباط کرنا بیان کیا گیا ہے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کو سمجھنا واجب ہے مگر ان کی تفہیم صرف ونحو کے حصول کے بغیر ناممکن ہے، اس لئے علماء نے صرف ونحو کی تعلیم کے حصول کو بدرجہ واجب قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ قاعدہ ہے کہ واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے، نماز فرض ہے مگر ادائیگی طہارت مکانیت، اور طہارت نفس پر موقوف ہے، اس لئے نماز سے پہلے طہارت کا ہونا بھی واجب ہے، مولف کتابچہ کا اظہار ہے کہ ان کا تعلق ایک علمی کاندان سے ہے تعارف کرانے والے ان کے ہم مشرب قمر الحسن بن حیدر نے لکھا کہ وہ ایک جید عالم دین فاضل دیوبند کے خلف الرشید ہیں، اس لئے یقیناً مولف کتابچہ کے والد اور دیگر اہل علم حضرات نے صرف ونحو، اصول وفقہ اور دیگر علوم مثلاً علم کلام جو صحت اعتقاد کی راہ دکھاتا ہے کی تعلیم ضرور حاصل کی ہوگی کچھ لوگوں نے تو مفتی عبد الکریم صاحب سے تعلیم بھی حاصل کی ہے، مولف کتابچہ فرمائیں کہ کل بدعۃ ضلالہ کا کلیہ ان پر بھی لاگو ہوتا ہے یا نہیں اگر لاگو ہوتا ہے تو یقیناً ان کا علمی خاندان بدعتی ہوا، اور بدعت کی چھاؤں میں رہا، ان کی زندگی کے شب وروز جو ان علوم کی تعلیم وتدریس میں صرف ہوئے گمراہی میں گزرے، لہٰذا مولف کتابچہ کو سب سے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے، کوئی صاحب عقل وشعور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتا، اور اگر علوم وفنون کسی فرد نے حاصل ہی نہیں کیے تو یہ الگ بات ہے مگر جید عالم دین ہونے کی صحت قابل تسلیم نہ ہوگی، اور اگر ان اہل علم حضرات پر کل بدعۃ ضلالۃ کا حکم نافذ العمل نہیں تو کیوں؟ وجہ استثناء کیا ہے لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ کل بدعۃ ضلالۃ عام مخصوص ہے اور اس میں بدعت سے مراد بدعت سیہ ہے اگر علمائے محققین کی اس توضیح اور تفسیر کو قابل اعتناء سمجھا جائے اور ہر نئی چیز پر بدعت، بدعت کا فتوی دیا جائے، تو

را معاشرہ بدعت کی لپیٹ میں آجائے گا، زندگی کا ہر قدم بدعت کی طرف اٹھے گا اور زندگی
عات کی اجیرن ہو کر رہ جائے گی اسلامی زندگی کے خدوخال، ماکولات، مشروبات، مرکوبات
ملبوسات، اور مکانات سب کے سب بدعات ہیں، تعمیرات کے نقوش، ڈیزائننگ، استعمال
ونے والے میٹریل، رنگ وروغن، لائٹنگ، آرائش اور تزیین کے مختلف نمونے، لاؤڈسپیکر
غیرہ کچھ عرصہ قبل ایجاد ہوئے صدر اول یا اس کے کافی عرصہ بعد تک ان کا وجود کہاں تھا، زکوۃ
اجب ہونے کا سکہ نصاب موجود کرنسی نہ تھا، اور بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ اور یہ سب کی سب
بدعات ہیں،،

مگر علماء نے ان کو مباح یعنی جائز قرار دیا ہے اگر کل بدعۃ ضلالہ کے عموم کو تسلیم کیا جائے بدعت حسنہ کی استثنائی شکل کو اس عموم سے خارج نہ کیا جائے تو پھر بتایئے اس دنیا میں کون سا کام نیکی کا ہے، جو بدعت سے خالی ہے، اور وہ کون سا مسلمان ہے جو بدعت کا مرتکب نہیں؟ اور وہ کون سا معاشرہ ہے جہاں بدعات کا دور دورہ نہیں؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں بدعت سے مراد البدعۃ المطلقۃ نہیں بلکہ مطلق البدعۃ ہے، تدبروتفکر،

اگر بقول مولف کتابچہ کل بدعۃ ضلالہ میں ہر نوع بدعت داخل ہے اور حدیث مبارکہ الایجاب الکلی کے حکم میں ہے تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان نعمت البدعۃ ھذہ، اس میں داخل ہے یا نہیں اگر داخل نہیں تو ہمارا موقف ثابت ہوا کہ حدہث مبارکہ میں جس بدعت کو ضلالہ فرمایا گیا ہے وہ بدعت سیءہ ہے بدعت حسنہ نہیں، اگر داخل ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے فرمان عمر رضی اللہ عنہ سن کر خاموشی کیوں اختیار فرمائی، کیا ان کی خاموشی بدعت ضلالہ کے جانتے ہوئے تھی؟ جس جماعت عامہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بدعت حسنہ فرمایا خلفائے ثلثہ، تابعین، تبع تابعین بلکہ آج تک پوری امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے، اگر کل بدعۃ ضلالہ میں داخل ہے تو لازم آیگا اجتماع الامتہ علی الضلالۃ، یہ محال شرعی ہے، اس لئے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع ضلالۃ پر نہیں ہوسکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجتماع الامۃ علی الضلالتہ کی نفی فرمادی ہے، فرمان حضرت عمر کے کل بدعۃ ضلالہ میں داخل ہونے پر محال شرعی لازم آتا ہے، محال شرعی بذات خود محال ہے، علمائے معقولات کا مسلمہ قانون ہے کہ جس امر سے محال لازم آتا ہو وہ امر خود محال ہوتا ہے لہذا فرمان عمر رضی اللہ عنہ کا حدیث مذکورہ میں داخل ہونا خود محال ہے، جب داخلہ محال ہے تو ثابت ہوا کہ حدیث مبارک میں بدعت سے مراد البدعۃ العامۃ نہیں بلکہ البدعۃ المخصوصہ ہے، اور وہ صرف بدعت سیءہ ہے اسی لیے ملا علی قاری نے امام نووی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے: "وقولہ کل بدعۃ ضلالۃ" عام مخصوص (مرقات) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کل بدعۃ ضلالہ عام مخصوص ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ صاحب ازہار نے بدعت کو موصوف اور اس کی صفت سیءہ کو یہاں مقدر کہا ہے اور حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ہر بدعت سیءہ ضلالت ہے امام شافعی کا مسلک بھی پہلے گزر چکا ہے کہ بدعت ضلالہ وہ شی ہے جس کا وجود یا عمل کتاب، سنت اقوال صحابہ یا اجماع امت کے مخالف اور مغائر ہو،

مولف کتابچہ بتائیں کہ ان کا علم حدیث مبارکہ کے بارے میں زیادہ ہے یا امام شافعی کا، امام شافعی جو بدعت حسنہ اور بدعت سیءہ کے قائل ہیں، اہل سنت وجماعت سے ہیں یا نہیں؟ امام نووی، ابن حجر عسقلانی، بدرالدین عینی، شیخ الدین بن عبدالسلام، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملا علی قاری، علامہ ابن عابدین الشامی، جیسے آسمان علم وفضل کے آفتاب جہانتاب جنہوں نے بدعت کو پانچ اقسام میں تقسیم فرمایا ہے اہل سنت وجماعت میں سے ہیں یا نہیں؟

بقول امام شافعی بدعت ضلالہ وہ عمل ہے جو کتاب وسنت، اثر صحابی یا اجماع امت کے مخالف ہو، بتائیے کس آیت، حدیث، اثر صحابی، اجماع امت کی مخالفت ہے قبر پر اذان دینے میں، جب ان امور میں سے کسی امر کی کسی طور پر مخالفت وقوع پذیر نہیں تو اذان برقبر بدعت ضلالہ کیسے ہوئی؟

ثابت ہوا اذان برقبر کو بدعت ضلالہ قرار دینا جہالت اور اصول وقواعد حدیث وفقہ سے بے بہرہ

را معاشرہ بدعت کی لپیٹ میں آجائے گا، زندگی کا ہر قدم بدعت کی طرف اٹھے گا اور زندگی
عات کی اجیرن ہو کر رہ جائے گی اسلامی زندگی کے خدوخال، ماکولات، مشروبات، مرکوبات
ملبوسات، اور مکانات سب کے سب بدعات ہیں، تعمیرات کے نقوش، ڈیزائینگ، استعمال
ونے والے میٹریل، رنگ وروغن، لائیٹنگ، آرائش اور تزیین کے مختلف نمونے، لاوڈ سپیکر
غیرہ کچھ عرصہ قبل ایجاد ہوئے صدر اول یا اس کے کافی عرصہ بعد تک ان کا وجود کہاں تھا، زکوۃ
اجب ہونے کا سکہ نصاب موجود کرنسی نہ تھا، اور بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ اور یہ سب کی سب
بدعات ہیں،،

مگر علماء نے ان کو مباح یعنی جائز قرار دیا ہے اگر کل بدعۃ ضلالہ کے عموم کو تسلیم کیا جائے بدعت حسنہ کی استثنائی شکل کو اس عموم سے خارج نہ کیا جائے تو پھر بتایئے اس دنیا میں کون سا کام نیکی کا ہے، جو بدعت سے خالی ہے، اور وہ کون سا مسلمان ہے جو بدعت کا مرتکب نہیں؟ اور وہ کون سا معاشرہ ہے جہاں بدعات کا دور دورہ نہیں؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں بدعت سے مراد البدعۃ المطلقۃ نہیں بلکہ مطلق البدعۃ ہے، تدبر وتفکر،

اگر بقول مولف کتابچہ کل بدعۃ ضلالہ میں ہر نوع بدعت داخل ہے اور حدیث مبارکہ الایجاب الکلی کے حکم میں ہے تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان نعمت البدعۃ ھذہ، اس میں داخل ہے یا نہیں اگر داخل نہیں تو ہمارا موقف ثابت ہوا کہ حدہث مبارکہ میں جس بدعت کو ضلالہ فرمایا گیا ہے وہ بدعت سیءہ ہے بدعت حسنہ نہیں، اگر داخل ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے فرمان عمر رضی اللہ عنہ سن کر خاموشی کیوں اختیار فرمائی، کیا ان کی خاموشی بدعت ضلالہ کے جانتے ہوئے تھی؟ جس جماعت عامہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بدعت حسنہ فرمایا خلفائے ثلثہ، تابعین، تبع تابعین بلکہ آج تک پوری امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے، اگر کل بدعۃ ضلالہ میں داخل ہے تو لازم آئیگا اجتماع الامتہ علی الضلالۃ، یہ محال شرعی ہے، اس لئے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع ضلالۃ پر نہیں ہوسکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجتماع الامۃ علی الضلالتہ کی نفی فرمادی ہے، فرمان حضرت عمر کے کل بدعۃ ضلالہ میں داخل ہونے پر محال شرعی لازم آتا ہے، محال شرعی بذات خود محال ہے، علمائے معقولات کا مسلمہ قانون ہے کہ جس امر سے محال لازم آتا ہو وہ امر خود محال ہوتا ہے لہٰذا فرمان عمر رضی اللہ عنہ کا حدیث مذکورہ میں داخل ہونا خود محال ہے، جب داخلہ محال ہے تو ثابت ہوا کہ حدیث مبارک میں بدعت سے مراد البدعۃ العامۃ نہیں بلکہ البدعۃ المخصوصہ ہے، اور وہ صرف بدعت سیء ہے اسی لیے ملا علی قاری نے امام نووی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے: ''وقولہ کل بدعۃ ضلالۃ'' عام مخصوص (مرقات) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کل بدعۃ ضلالہ عام مخصوص ہے، پہلے گزرچکا ہے کہ صاحب ازہار نے بدعت کو موصوف اور اس کی صفت سیء کو یہاں مقدر کہا ہے اور حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ہر بدعت سیء ضلالت ہے امام شافعی کا مسلک بھی پہلے گزرچکا ہے کہ بدعت ضلالہ وہ شی ہے جس کا وجود یا عمل کتاب، سنت اقوال صحابہ یا اجماع امت کے مخالف اور مغائر ہو،

مولف کتابچہ بتائیں کہ ان کا علم حدیث مبارکہ کے بارے میں زیادہ ہے یا امام شافعی کا، امام شافعی جو بدعت حسنہ اور بدعت سیء کے قائل ہیں، اہل سنت وجماعت سے ہیں یا نہیں؟ امام نووی، ابن حجر عسقلانی، بدرالدین عینی، شیخ الدین بن عبدالسلام، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملا علی قاری، علامہ ابن عابدین الشامی، جیسے آسمان علم وفضل کے آفتاب جہانتاب جنہوں نے بدعت کو پانچ اقسام میں تقسیم فرمایا ہے اہل سنت وجماعت میں سے ہیں یا نہیں؟

بقول امام شافعی بدعت ضلالہ وہ عمل ہے جو کتاب وسنت، اثر صحابی یا اجماع امت کے مخالف ہو، بتائیے کس آیت، حدیث، اثر صحابی، اجماع امت کی مخالفت ہے قبر پر اذان دینے میں، جب ان امور میں سے کسی امر کی کسی طور پر مخالفت وقوع پذیر نہیں تو اذان بر قبر بدعت ضلالہ کیسے ہوئی؟

ثابت ہوا اذان بر قبر کو بدعت ضلالہ قرار دینا جہالت اور اصول وقواعد حدیث وفقہ سے بے بہرہ

ہونے کی دلیل ہے، مولف کتابچہ نے صفحہ ۲۲ پر لکھا کہ یہ کلیہ امام اہل سنت ملاعلی قاری کا ہے ،مولف کتابچہ ملاعلی قاری کو اہل سنت کا امام تسلیم کرتے ہیں مگر جب ملاعلی قاری کل بدعۃ ضالۃ کے عموم کی نفی کرتے ہیں اور بدعت کو پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرماتے ہیں تو ان کی بات کو تسلیم نہیں کرتے، تعجب کی بات ہے، مزید یہ کہ ابن حجر عسقلانی کے قول کہ اذان برقبر بدعت ہے پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں اور جب وہی ابن حجر بدعت کو ابتدائی طور پر دو اقسام اور پھر ثانوی طور پر پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرماتے ہیں تو تسلیم نہیں کرتے، ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں، یہ کیسا عقیدہ ہے، شوربا حرام اور بوٹیاں حلال، امام ابن حجر عسقلانی نے بدعت ضلالہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ: "تطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتكون مذمومة "شرعی اعتبار سے جو بدعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل کے مقابل اور معارض ہو وہ مذمومہ یعنی بدعت سیۂ ہے،،

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے قول، فعل اور تقریر کا نام ہے، مانعین اذان برقبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی کوئی سنت دکھادیں اذان دینے میں جس کی مخالفت لازم آتی ہو، اذان برقبر کی ممانعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرام کا کوئی قول اور کوئی فعل منقول نہیں، بدعت ضلالہ کا فتوی بدون تحقیق اور بدعت، بدعت کی رٹ محض زبانی، اور مبنی بررائے ہے،،

مولف کتابچہ بتائیں کہ بدعت ضلالہ کے بارے میں ان کا علم زیادہ ہے یا ابن حجر عسقلانی کا؟

بدعت ضلالہ کی توضیح کرتے ہوئے شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

'ہرچہ پیدا کردہ اند، وہرچہ پیدا کردہ است از انچہ بداں تغیر سنت ومخالفت آں لازم آید، قولاوعملا واعتقادا ضلالت است، ومردود است، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد، وفرمود كل محدث بدعة و كل بدعة ضلالة "(مکتوبات

،ص ۵۵) ہر نیا کام جو معرض وجود میں آئے اگر اس سے زبانی، عملی یا اعتقادی طور پر سنت رسول اللہ ﷺ میں تغیر یا اس کی مخالفت لازم آتی ہو تو وہ امر جدید ضلالت ہے، مردود ہے،

مزید آپ کا ارشاد ہے ہر امر جدید جس کی کوئی سند کتاب، سنت، اثر صحابی یا اجماع امت میں نہ ہو وہ بدعت ضلالہ ہے،

عبارت مذکورہ بالا سے معلوم ہوا بدعت ضلالہ اس امر جدید کا نام ہے جس سے سنت رسول ﷺ کی مخالفت یا اس پر عمل کرنے سے سنت میں تبدیلی لازم آتی ہو، یہ تبدیلی اور مخالفت قول کے ذریعے لازم آرہی ہو یا عمل اور اعتقاد کی بنیاد پر، بدعت ضلالت ہوگی، قبر بر اذان دینے سے سنت میں تبدیلی لازم آتی ہے نہ مخالفت، اس میں نہ قولاً تبدیلی اور مخالفت ہے نہ فعلاً اور اعتقاداً ،لہٰذا اذان بر قبر بدعت ضلالہ نہیں،،

شیخ محقق نے بدعت ضلالہ کیلئے تین چیزیں ارشاد فرمائی ہیں،

۱: تغیر سنت ،قولی طور پر یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت میں قول کے ذریعے ترمیم یا اضافہ کیا جائے ،ترمیم یا اضافہ کیلئے بصورت نص آپ کے قول وفعل کا ہونا ضروری ہے، اذان بر قبر کی مانعت پر رسول اللہ ﷺ کا کوئی قول، یا فعل موجود نہیں جس میں ترمیم یا اضافہ کیا گیا ہو،

۲: تغیر سنت بلحاظ فعل ،یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت میں کوئی کام کرنا یا اس کے برعکس کوئی عمل کرنا یہ صورت اس بات کی متقاضی ہے کہ اذان بر قبر دے کر آپ ﷺ کے کسی فعل کی مغائرت کی گئی ہو،

۳: تغیر سنت بلحاظ عقیدہ کوئی مسلمان اعتقادی طور پر آپ کی سنت مبارکہ کا منکر یا اس میں کسی ردو بدل کا مجاز نہیں ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ آپ کے اقوال شریفہ ،اور افعال مقدسہ جز وایمان ہیں، ان میں رائے زنی کا حق کسی بندہ مومن کو نہیں دیا گیا، اس لئے کہ قرآن حکیم نے ان امور کو بلا چون وچراں تسلیم کرنے کا پابند کیا ہے، ارشاد فرمایا: ما اتکم الرسول

ہونے کی دلیل ہے، مولف کتابچہ نے صفحہ ۲۲ پر لکھا کہ یہ کلیہ امام اہل سنت ملا علی قاری کا ہے ،مولف کتابچہ ملا علی قاری کو اہل سنت کا امام تسلیم کرتے ہیں مگر جب ملا علی قاری کل بدعة ضالة کے عموم کی نفی کرتے ہیں اور بدعت کو پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرماتے ہیں تو ان کی بات کو تسلیم نہیں کرتے، تعجب کی بات ہے، مزید یہ کہ ابن حجر عسقلانی کے قول کہ اذان برقبر بدعت ہے پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں اور جب وہی ابن حجر بدعت کو ابتدائی طور پر دو اقسام اور پھر ثانوی طور پر پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرماتے ہیں تو تسلیم نہیں کرتے، ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں، یہ کیسا عقیدہ ہے، شوربا حرام اور بوٹیاں حلال، امام ابن حجر عسقلانی نے بدعت ضلالہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ: "تطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتکون مذمومة" شرعی اعتبار سے جو بدعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل کے مقابل اور معارض ہو وہ مذمومہ یعنی بدعت سیہء ہے،،

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے قول، فعل اور تقریر کا نام ہے، مانعین اذان برقبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی کوئی سنت دکھا دیں اذان دینے میں جس کی مخالفت لازم آتی ہو، اذان برقبر کی ممانعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرام کا کوئی قول اور کوئی فعل منقول نہیں، بدعت ضلالہ کا فتوی بدون تحقیق اور بدعت، بدعت کی رٹ محض زبانی، اور مبنی بررائے ہے،،

مولف کتابچہ بتائیں کہ بدعت ضلالہ کے بارے میں ان کا علم زیادہ ہے یا ابن حجر عسقلانی کا؟

بدعت ضلالہ کی توضیح کرتے ہوئے شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

'ہرچہ پیدا کردہ اند، وہرچہ پیدا کردہ است ازانچہ بداں تغیر سنت ومخالفت آں لازم آید، قولا وعملا واعتقادا ضلالت است، ومردود است، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو رد، وفرمود کل محدث بدعة وکل بدعة ضلالة "(مکتوبات

ص ۵۵) ہر نیا کام جو معرض وجود میں آئے اگر اس سے زبانی، عملی یا اعتقادی طور پر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تغیر یا اس کی مخالفت لازم آتی ہو تو وہ امر جدید ضلالت ہے، مردود ہے،

مزید آپ کا ارشاد ہے ہر امر جدید جس کی کوئی سند کتاب، سنت، اثر صحابی یا اجماع امت میں نہ ہو وہ بدعت ضلالہ ہے،

عبارت مذکورہ بالا سے معلوم ہوا بدعت ضلالہ اس امر جدید کا نام ہے جس سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت یا اس پر عمل کرنے سے سنت میں تبدیلی لازم آتی ہو، یہ تبدیلی اور مخالفت قول کے ذریعے لازم آ رہی ہو یا عمل اور اعتقاد کی بنیاد پر، بدعت ضلالت ہوگی، قبر بر اذان دینے سے سنت میں تبدیلی لازم آتی ہے نہ مخالفت، اس میں نہ قولاً تبدیلی اور مخالفت ہے نہ فعلاً اور اعتقاداً ،لہٰذا اذان بر قبر بدعت ضلالہ نہیں،،

شیخ محقق نے بدعت ضلالہ کیلئے تین چیزیں ارشاد فرمائی ہیں،

۱: تغیر سنت، قولی طور پر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں قول کے ذریعے ترمیم یا اضافہ کیا جائے، ترمیم یا اضافہ کیلئے بصورت نص آپ کے قول وفعل کا ہونا ضروری ہے، اذان بر قبر کی مانعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول، یا فعل موجود نہیں جس میں ترمیم یا اضافہ کیا گیا ہو،

۲: تغیر سنت بلحاظ فعل، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی مخالفت میں کوئی کام کرنا یا اس کے برعکس کوئی عمل کرنا یہ صورت اس بات کی متقاضی ہے کہ اذان بر قبر دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی فعل کی مغائرت کی گئی ہو،

۳: تغیر سنت بلحاظ عقیدہ کوئی مسلمان اعتقادی طور پر آپ کی سنت مبارکہ کا منکر یا اس میں کسی ردو بدل کا مجاز نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ آپ کے اقوال شریفہ، اور افعال مقدسہ جزو ایمان ہیں، ان میں رائے زنی کا حق کسی بندہ مومن کو نہیں دیا گیا، اس لئے کہ قرآن حکیم نے ان امور کو بلا چون وچراں تسلیم کرنے کا پابند کیا ہے، ارشاد فرمایا: ما اتکم الرسول

فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا" رہی آپ کے قول، یا فعل کی مخالفت تو اگر یہ مخالفت تصور کی حد تک ہو تو بھی بندۂ مومن کو ایمان سے محروم کر دیتی ہے لہٰذا ان امور کی خلاف ورزی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، بحمد اللہ اذان برقبر میں مذکورہ بالا اشیاء میں سے کسی بھی شے کا ارتکاب لازم نہیں آتا اس لئے اذان برقبر بدعت سیہ یا بدعت مذمومہ نہیں، اور نہ ہی حدیث کل محدث بدعۃ اور کل بدعۃ ضلالۃ اس پر صادق آتی ہے،

یہی شیخ محقق بدعت حسنہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

''ہم از وجوہ نصر دین حق، قیام است بہ تحصیل اسبابے کہ موجب بقاء وتقویت دین وملت است ،آن علم است وعمل، وعلم کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوست وعلومیکہ مبادی ووسائل وممد ومعاون آن بود چنانچہ علم صرف ونحو، وسائر علوم دینیہ وقواعد عربیہ، علم دین فقہ است وتفسیر وحدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث'' (مکتوبات، ص، ۵۳)

دین حق کی تصریحات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان اسباب کو حاصل کیا جائے جو دین وملت کی بقاء اور تقویت کا باعث ہیں، اور وہ علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم ہے، اور وہ علوم ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفہیم میں معاون اور مددگار ہیں، مثلاً صرف اور نحو کا علم دیگر دینی علوم، اور عربی کے قواعد، علم دین فقہ، تفسیر اور حدیث کے علم کا نام ہے جو شخص ان کو چھوڑ کر دیگر علوم حاصل کرتا ہے وہ بھٹک جاتا ہے،،

شیخ محقق نے اپنے اس مکتوب میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ دین حق کو سمجھنا اور اس کی نشر واشاعت کرنا فرض عین ہے، مگر دین کی سمجھ اور نصرت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم حاصل نہ کی جائے، ان کے معانی اور مطالب معلوم نہ کیے جائیں، کتاب وسنت کے معانی اور تفاسیر کا علم صرف ونحو اور دیگر علوم وقواعد پر موقوف ہے جب تک ان علوم وفنون کو حاصل نہ کیا جائے کتاب وسنت کا علم اور ان کے مطابق عمل کرنا ناممکنات

میں سے ہے لہذا قرآن وسنت کی تعلیمات سے قبل صرف ونحو، دیگر علوم وفنون اور قواعد ع
سیکھنا بدرجہ واجب ہے، ان علوم فنون کا وجود قرون اولی میں نہ تھا یہ بعد کی پیداوار ہے، سب
سب بدعات ہیں، مگر علمائے محققین نے ان کا سیکھنا واجب اور لازم قرار دیا ہے، بد
اور وجوب دو مختلف عنوان اور دو مختلف احکامات کے موضوع ہیں، مگر علمائے محققین نے شرعی
کے حصول کے پیش نظر دو متضاد حیثیات اور عنوانات کو یکجا کرتے ہوئے دونوں پر ایک
واجب لاگو کیا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صرف ونحو اور دیگر علوم وفنون کا سیکھنا واجب
قرون اولیٰ میں ان کا وجود ان کی تعلیمات کیوں ناپید ہیں؟ جواباً کہا جائے گا کہ رسول
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ خیر القرون ہے کتاب وسن
تفسیرات اور تعبیرات من وعن اصلی حالت اور اصل الفاظ، سند اور متن مس موجود تھیں،
وسنت کے معانی اور مطالب سمجھنے والے اہل عرب موجود تھے، عربی النسل ہونے کے ناطے
زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے ان علوم وفنون کی ضرورت نہ تھی، جب اسلام خطہ عرب سے
عجم میں داخل ہوا تو عجمی لوگوں کی قرآن وسنت کی تفہیمات کیلئے ان علوم وفنون کی ضرورت
ہوئی، اور ان کو مدون کیا گیا تا کہ اہل عجم کیلئے قرآن وسنت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہ
بالکل اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر تبع تابعین تک کا زمانہ علم وعمل کا زمانہ ہے
اور تقوی کا زمانہ ہے، رحمت اور بخشش کا زمانہ ہے مگر جوں ہی اس نورانی اور عرفانی د
دنیائے عرب سے منہ پھیرا عجم کے رسوم ورواج اور عملی کوتائیوں نے عرب وعجم میں اپنے ڈ
ڈال لئے، دینی جذبے مجروح اور دینیات کی طرف توجہ کم ہونے لگی تو علمائے امت نے
وسنت کی روشنی مین ان کی رہنمائی فرمائی، امور مستحبہ اور کارہائے خیر کے مختلف نمونے ا
سامنے پیش فرمائے، اور فرمان رسول من سن فی الاسلام سنة حسنة الحدیث
المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن" سے مکمل توضیح اور تشریح فرمائی، صرف ونحو، د

فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا" رہی آپ کے قول، یا فعل کی مخالفت تو اگر یہ مخالفت تصور کی حد تک ہوتو بھی بندۂ مومن کو ایمان سے محروم کر دیتی ہے لہٰذا ان امور کی خلاف ورزی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، بحمد للہ اذان برقبر میں مذکورہ بالا اشیاء میں سے کسی بھی شے کا ارتکاب لازم نہیں آتا اس لئے اذان برقبر بدعت سیہ یا بدعت مذمومہ نہیں، اور نہ ہی حدیث کل محدث بدعة اور کل بدعة ضلالة اس پر صادق آتی ہے،

یہی شیخ محقق بدعت حسنہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

''ہم از وجوہ نصر دین حق، قیام است بہ تحصیل اسبابے کہ موجب بقاء وتقویت دین وملت است ،آن علم است وعمل، وعلم کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوست وعلومیکہ مبادی ووسائل وممد ومعاون آن بود چنانچہ علم صرف ونحو، وسائر علوم دینیہ وقواعد عربیہ، علم دین فقہ است وتفسیر وحدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث'' (مکتوبات، ص، ۵۳)

دین حق کی تصریحات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان اسباب کو حاصل کیا جائے جو دین وملت کی بقاء اور تقویت کا باعث ہیں، اور وہ علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم ہے، اور وہ علوم ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفہیم میں معاون اور مددگار ہیں، مثلاً صرف اور نحو کا علم دیگر دینی علوم ، اور عربی کے قواعد ، علم دین فقہ، تفسیر اور حدیث کے علم کا نام ہے جو شخص ان کو چھوڑ کر دیگر علوم حاصل کرتا ہے وہ بھٹک جاتا ہے،،

شیخ محقق نے اپنے اس مکتوب میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ دین حق کو سمجھنا اور اس کی نشر واشاعت کرنا فرض عین ہے، مگر دین کی سمجھ اور نصرت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم حاصل نہ کی جائے، ان کے معانی اور مطالب معلوم نہ کیے جائیں، کتاب وسنت کے معانی اور تفاسیر کا علم صرف ونحو اور دیگر علوم وقواعد پر موقوف ہے جب تک ان علوم وفنون کو حاصل نہ کیا جائے کتاب وسنت کا علم اور ان کے مطابق عمل کرنا ناممکنات

میں سے ہے لہٰذا قرآن وسنت کی تعلیمات سے قبل صرف ونحو، دیگر علوم وفنون اور قواعد عربیہ کا سیکھنا بدرجہ واجب ہے، ان علوم فنون کا وجود قرون اولی میں نہ تھا یہ بعد کی پیداوار ہے، سب کے سب بدعات ہیں، مگر علمائے محققین نے ان کا سیکھنا واجب اور لازم قرار دیا ہے، بدعت اور وجوب دو مختلف عنوان اور دو مختلف احکامات کے موضوع ہیں، مگر علمائے محققین نے شرعی فوائد کے حصول کے پیش نظر دو متضاد حیثیات اور عنوانات کو یکجا کرتے ہوئے دونوں پر ایک ہی حکم واجب لاگو کیا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صرف ونحو اور دیگر علوم وفنون کا سیکھنا واجب ہے تو قرون اولیٰ میں ان کا وجود ان کی تعلیمات کیوں ناپید ہیں؟ جواباً کہا جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ خیر القرون ہے کتاب وسنت کی تفسیرات اور تعبیرات من وعن اصلی حالت اور اصل الفاظ، سند اور متن مس موجود تھیں، قرآن وسنت کے معانی اور مطالب سمجھنے والے اہل عرب موجود تھے، عربی النسل ہونے کے ناطے عربی زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے ان علوم وفنون کی ضرورت نہ تھی، جب اسلام خطہ عرب سے نکل کر عجم میں داخل ہوا تو عجمی لوگوں کی قرآن وسنت کی تفہیمات کیلئے ان علوم وفنون کی ضرورت محسوس ہوئی، اور ان کو مدون کیا گیا تا کہ اہل عجم کیلئے قرآن وسنت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو، بالکل اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر تبع تابعین تک کا زمانہ علم وعمل کا زمانہ ہے، نیکی اور تقوی کا زمانہ ہے، رحمت اور بخشش کا زمانہ ہے مگر جوں ہی اس نورانی اور عرفانی دور نے دنیائے عرب سے منہ پھیرا عجم کے رسوم ورواج اور عملی کوتائیوں نے عرب وعجم میں اپنے ڈیرے ڈال لئے، دینی جذبے مجروح اور دینیات کی طرف توجہ کم ہونے لگی تو علمائے امت نے قرآن وسنت کی روشنی مین ان کی رہنمائی فرمائی، امور مستحبہ اور کارہائے خیر کے مختلف نمونے ان کے سامنے پیش فرمائے، اور فرمان رسول من سن فی الاسلام سنة حسنة الحدیث ماراہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن "سیمکمل توضیح اور تشریح فرمائی، صرف ونحو، دیگر علوم

فنون ہوں یا تثویب ہائے نماز، خطیب کے روبرو اذان خطبہ ہو یا لاؤڈ سپیکر کا استعمال، اذان بر قبر ہو یا دعا بعد نماز جنازہ ہر مسئلہ کو قرآن وسنت اور اجتہادات مجتہدین سے واضح اور مکمل فرمایا صرف نحو و دیگر علوم وفنون، قرآن وسنت کی تفہیم میں مفید ہیں، اس لئے بدعت ہو کر بھی ان کا سیکھنا واجب ہے، اذان بر قبر بدعت حسنہ ہو کر بھی میت کیلئے مفید اور باعث اطمینان ہے اس لئے ضلالہ اور مذموم نہیں، واضح رہے کہ کل بدعۃ ضلالہ میں بدعت سے مراد وہ بدعۃ ضلالہ ہے جس کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے،،

حضرت بلال بن حارث مزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "من احیا سنة من سنتی وقد امیتت بعدی فان له من الاجر مثل اجور من عمل بها من غیر ان ینقص من اجورهم شیئا ومن ابتدع بدعة ضلالة لا یرضاها الله ورسوله" (الحدیث مشکوۃ)

جس شخص نے میری سنت کے مٹ جانے کے بعد اس کو زندہ کیا اس کو ان تمام لوگوں کے اجر کے برابر ثواب ملے گا جو اس پر عمل کرینگے،، لیکن ان کے ثواب میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، اور جس نے ایسی چیز کا اختراع کیا جو گمراہی ہے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو پسند نہیں کرتے، (الخ)

یہ حدیث دوسری احادیث جن میں کل بدعۃ ضلالۃ، کل محدث بدعۃ کے الفاظ فرمائے گئے ہیں کیلئے تفسیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی تفسیر فرمادی کہ بدعت سے مراد بدعت ضلالہ ہے یعنی بدعت سیہ ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند نہیں کرتے، بدعت حسنہ اس سے خارج ہے اور احادیث بدعت میں بدعت سے مراد مطلقاً بدعت نہیں تا کہ بدعت حسنہ اور بدعت سیہ دونوں کو شامل ہو، بلکہ صرف بدعت ضلالہ مراد ہے،،

کتابچہ اور ان کے ہم نوؤں کا بدوں تحقیق ہر نوع بدعت کو ضلالہ قرار دینا صحیح ہے یا جو معنی بدعۃ ضلالۃ یا کل محدثۃ بدعۃ کا جو علمائے امت نے اپنی اپنی شہرہ آفاق تحقیقی کتب میں بیان فرمایا ہے وہ صحیح ہے، قارئین خود فیصلہ کریں کہ اذان بر قبر کو بدعت کہنے والوں کا موقف کس قدر حقیقت سے دور ہے؟

ں کتابچہ نے اذان برقبر کے بدعت اور ناجائز ہونے پر آیت کریمہ ”الیوم اکملت لکم

م“

ہ) کو بھی دلیل بنایا ہے، اس آیہء کریمہ کے سیاق وسباق پر جو تحریر ہوئی ہے وہ مولف کی

نفرادی رائے ہے آیہء مقدسہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں،، آیہء مقدسہ کا مفہوم بیان کرتے

ے علامہ محمود آلوسی نے فرمایا:

المراد اکمال الدین نفسه ببیان مایلزم بیانه ویستنبط العقائد والتواقیف علی

ل الشرع وقوانین الاجتهاد“ (روح المعانی)

: آیہء مقدسہ میں تکمیل دین سے مراد یہ ہے کہ یہ دین اسلام کے بیان اور اس سے مسائل

ستنباط کیلئے جو امور ضروری تھے ان کو بیان کردیا گیا ہے، عقائد کے قواعد مقرر کردیئے گئے

شریعت کے اصولوں اور اجتہاد کے قوانین سے واقف کردیا گیا ہے،

ر آن وسنت کی تفاصیل بیان ہو چکی ہیں، جو احکام قرآن وسنت کی نصوص کے ذریعے بیان

ں ہوئے وہ غیر منصوص علیھا ہیں، ان کے استنباط کیلئے قرآن وسنت میں اصول ذکر کردیے

ہیں، عقائد کے بنیادی اصول وضع کردیئے گئے ہیں، ادلہ شرعیہ کو مقرر کردیا گیا ہے، اجتہاد

انین بھی بنادیئے گئے ہیں، مولف کتابچہ کا یہ کہنا کہ بوقت نزول تمام دین مکمل ہو چکا تھا اور

ں پہلو تشنہ تکمیل نہ تھا، اسلام کے پورے احکام اور جمیع مسائل بیان ہو چکے تھے غلط ہے، اگر

یم کرلیا جائے کہ دین تشریحی اور تشریعی لحاظ سے کامل ہو چکا تھا تو آیت کلالہ جو ایک مستقل

ں اور قانون ہے ورثا کی وراثت کا مسئلہ ہے بعد میں کیوں نازل ہوئی؟ جب دین بوقت

ں آیہء کریمہ مکمل تھا اس کو بعد میں نازل کرنے کا کیا مقصد تھا؟ اور اس کو نازل فرما کر کون سی

پوری کی گئی؟

رت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیہء مقدسہ کا معنی بیان فرمایا ہے کہ:

فنون ہوں یا تثویب ہائے نماز، خطیب کے روبرو اذان خطبہ ہو یا لاؤڈ سپیکر کا استعمال، اذان بر قبر ہو یا دعا بعد نماز جنازہ ہر مسئلہ کو قرآن وسنت اور اجتہادات مجتہدین سے واضح اور مکمل فرمایا صرف نحو و دیگر علوم وفنون، قرآن وسنت کی تفہیم میں مفید ہیں، اس لئے بدعت ہو کر بھی ان کا سیکھنا واجب ہے، اذان بر قبر بدعت حسنہ ہو کر بھی میت کیلئے مفید اور باعث اطمینان ہے اس لئے ضلالہ اور مذموم نہیں، واضح رہے کہ کل بدعة ضلالہ میں بدعت سے مراد وہ بدعة ضلالہ ہے جس کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے،،

حضرت بلال بن حارث مزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "من احیا سنة من سنتی و قد امیتت بعدی فان له من الاجر مثل اجو ر من عمل بها من غیر ان ینقص من اجور هم شیئا و من ابتدع بدعة ضلالة لا یر ضاها الله و ر سو له" (الحدیث مشکوۃ)

جس شخص نے میری سنت کے مٹ جانے کے بعد اس کو زندہ کیا اس کو ان تمام لوگوں کے اجر کے برابر ثواب ملے گا جو اس پر عمل کرینگے،، لیکن ان کے ثواب میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، اور جس نے ایسی چیز کا اختراع کیا جو گمراہی ہے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو پسند نہیں کرتے، (الخ)

یہ حدیث دوسری احادیث جن میں کل بدعة ضلالة، کل محدث بدعة کے الفاظ فرمائے گئے ہیں کیلئے تفسیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی تفسیر فرمادی کہ بدعت سے مراد بدعت ضلالہ ہے یعنی بدعت سیہ ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند نہیں کرتے، بدعت حسنہ اس سے خارج ہے اور احادیث بدعت میں بدعت سے مراد مطلقاً بدعت نہیں تا کہ بدعت حسنہ اور بدعت سیہ دونوں کو شامل ہو، بلکہ صرف بدعت ضلالہ مراد ہے،،

کتابچہ اور ان کے ہم نوؤں کا بدوں تحقیق ہر نوع بدعت کو ضلالہ قرار دینا صحیح ہے یا جو معنی بدعة ضلالة یا کل محدثة بدعة کا جو علمائے امت نے اپنی اپنی شہرہ آفاق تحقیقی کتب میں بیان فرمایا ہے وہ صحیح ہے، قارئین خود فیصلہ کریں کہ اذان بر قبر کو بدعت کہنے والوں کا موقف کس قدر حقیقت سے دور ہے؟

مولف کتابچہ نے اذان برقبر کے بدعت اورناجائز ہونے پر آیت کریمہ "الیوم اکملت لکم دینکم"

(الایہ) کوبھی دلیل بنایا ہے، اس آیہء کریمہ کے سیاق وسباق پر جوتحریر ہوئی ہے وہ مولف کی اپنی انفرادی رائے ہے آیہء مقدسہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں،، آیہء مقدسہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے علامہ محمود آلوسی نے فرمایا:

"لان المراد اکمال الدین نفسه ببیان مایلزم بیانه ویستنبط العقائدو التواقیف علی اصول الشرع وقوانین الاجتهاد" (روح المعانی)

ترجمہ: آیہء مقدسہ میں تکمیل دین سے مراد یہ ہے کہ یہ دین اسلام کے بیان اوراس سے مسائل کے استنباط کیلئے جوامور ضروری تھے ان کو بیان کردیا گیا ہے، عقائد کے قواعد مقرر کردیئے گئے ہیں، شریعت کے اصولوں اوراجتہاد کے قوانین سے واقف کردیا گیا ہے،

یعنی قرآن وسنت کی تفاصیل بیان ہوچکی ہیں، جواحکام قرآن وسنت کی نصوص کے ذریعے بیان نہیں ہوئے وہ غیر منصوص علیھا ہیں، ان کے استنباط کیلئے قرآن وسنت میں اصول ذکر کردیے گئے ہیں، عقائد کے بنیادی اصول وضع کردیئے گئے ہیں، ادلہ شرعیہ کومقرر کردیا گیا ہے، اجتہاد کے قوانین بھی بنادیئے گئے ہیں، مولف کتابچہ کا یہ کہنا کہ بوقت نزول تمام دین مکمل ہو چکا تھا اور کوئی پہلوتشنہ تکمیل نہ تھا، اسلام کے پورے احکام اور جمیع مسائل بیان ہوچکے تھے غلط ہے، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ دین تشریحی اورتشریعی لحاظ سے کامل ہوچکا تھا توآیت کلالہ جوایک مستقل اصول اورقانون ہے ورثا کی وراثت کا مسئلہ ہے بعد میں کیوں نازل ہوئی؟ جب دین بوقت نزول آیہء کریمہ مکمل تھا اس کو بعد میں نازل کرنے کا کیا مقصد تھا؟ اوراس کونازل فرما کرکون سی کمی پوری کی گئی؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیہء مقدسہ کا معنی بیان فرمایا ہے کہ:

"ان المعنی الیوم اکملت لکم حدودی و فرائض و جلالی، و حرامی بتنریل ما انزلت وبیان بینت لکم فلا زیادۃ فی ذالکم و لا نقصان منہ، بانسخ بعد ھذا الیوم"

ترجمہ: الیوم اکملت لکم کا معنی یہ ہے کہ آج کے دن میں نے اپنی حدود و، فرائض، حلال اور حرام کو آیات کریمہ کے نزول اور بیان سے پوری طرح بیان کر دیا ہے آج کے بعد نسخ حکم کے ذریعے کوئی کمی بیشی نہ ہوگی،،

روح المعانی کے اقتسابات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آیہء کریمہ کے ذریعے یہ بارو کرایا گیا تھا کہ حرام، حلال، حدود، فرائض کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے آج کے دن تک جو حلال ہے وہ حلال ہی رہیگا اور جو حرام ہے وہ حرام رہے گا، حدود اللہ بھی بیان ہو چکی ہیں، جو امور فرض کیے گئے تھے وہی فرائض ہونگے، جو احکام بیان ہو چکے ہیں وہ حتمی ہیں، آج کے بعد ناسخ اور منسوخ کا ان میں کوئی احتمال نہیں، جو امور منصوص علیہا نہیں ہیں ان کے استخراج کیلئے قوانین اجتہاد بھی وضع کر دیے گئے ہیں، آیہء کریمہ نے حلال، حرام، حدود اللہ، فرائض میں ترمیم یا اضافہ کا دروازہ تو قیامت تک کیلئے بند کر دیا ہے، مگر اجتہاد اور قیاس کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، اگر اجتہاد اور قیاس سے مستنبط ہونے والے احکام بدعت ضلالۃ اور دین میں مداخلت شمار ہوتے تو اجتہاد کے دروازے کو نہی کے ذریعے مقفل کر دیا جاتا، مگر آیہء کریمہ کے نزول کے بعد بھی صحابہ، تابعین، تبع تابعین نے غیر منصوص علیہا احکام کیلئے قرآن وسنت میں اجتہاد کیا، مولف کتابچہ فرمائیں کہ (الیوم اکملت لکم دینکم) سے مراد جمیع دین اسلام کی تکمیل مراد ہے یا اصول وقواعد کی؟ اگر من کل الوجوہ دین کی تکمیل مراد ہے جیسا کہ آپ نے کتابچہ کے صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱، پر تحریر کیا ہے تو حجۃ الوداع کے بعد جو اجتہادات ہوئے اور ان کی بنیاد پر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی مذہب معرض وجود میں آئے، مداخلت فی الدین ہوئی، اور تمام اجتہادات بدعات ضلالۃ ہوئے، جب اجتہادات بدعات ضلالہ ہوئے

مہ مجتہدین اہل سنت و جماعت سے کس طرح ہوئے ؟ اور ان کے مقلدین مسلمان کس
ج ہوئے ؟ کتابچہ، ۱۰، ۱۱، پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے بہتان ہے اختراء ہے، کوئی مسلمان دین
ی رہ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ زبان سے کہے، امور حسنہ کی ترغیب اگر دی جاتی
حدیث من سن فی الاسلام سنة حسنة، مار اہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن
بنیاد پر دی جاتی ہے، اور یہ ہرگز مداخلت فی الدین نہیں، دین سے وہی امور مراد ہیں جن کا
صاحب روح المعانی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے کیا ہے اور اگر
ں اور حرام، فرائض، حدود اللہ، اجتہاد وغیرہ کے اصول اور قواعد مراد ہیں تو ہمارا موقف درست
مولف کتابچہ کی تقریر مندرجہ ص، ۱۰، غلط ہے اور اجتہادات مداخلت فی الدین نہیں بلکہ الیوم
ت لکم دینکم کی متممات، مجوزات اور جزئیات تصور ہونگے، اگر اجتہادات مداخلت فی
ین ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین من سن فی الاسلام سنة حسنة (الحدیث) ماراہ المسلمون
فھو عند اللہ حسن،، کا کیا مقصد ہے؟ اور کس امر اور کس قوم کی طرف اشارہ ہے؟ حافظ ابن کثیر
آیت مذکورہ کے تحت نقل فرمایا ہے: ”فلا حلال الا ما احله، ولا حرام الا ما حرمه ولا
، الا ما شرعه“ (ابن کثیر) حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال فرمایا اور حرام وہی ہے جس کو
نے حرام فرمایا اور دین وہی ہے جس کو اللہ نے واضح فرمایا،

ر کی تفسیر سے ثابت ہوا کہ تکمیل دین سے مراد، عقائد، فرائض اور حدود اللہ کی تکمیل ہے جس کا
صہ یہ ہے کہ حلال وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا، اور حرام کی حرمت وہاں تک ہے
ں تک اللہ نے بیان کی ہے، دین وہی ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی شکل میں ہے
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعلیم دی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریعی اور تشریحی عمل میں
تہاد بھی داخل ہے، اجتہادی مسائل امور شرعیہ ہیں، اجتہادی، فقہی مسائل کا انکار دین کے
قابل قدر حصے کا انکار ہے ہر حکم کتاب وسنت میں مذکورہ نہیں بلکہ بعض مسائل کا حکم اجتہاد

"ان المعنی الیوم اکملت لکم حدودی و فرائض و جلالی، و حرامی بتنریل ماانزلت وبیان بینت لکم فلازیادۃ فی ذالکم و لا نقصان منہ، بانسخ بعد ھذاالیوم"

ترجمہ: الیوم اکملت لکم کا معنی یہ ہے کہ آج کے دن میں نے اپنی حدودو، فرائض، حلال اور حرام کو آیات کریمہ کے نزول اور بیان سے پوری طرح بیان کردیا ہے آج کے بعد نسخ حکم کے ذریعے کوئی کمی بیشی نہ ہوگی،،

روح المعانی کے اقتسابات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آیہء کریمہ کے ذریعے یہ باروکرایا گیا تھا کہ حرام، حلال، حدود، فرائض کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پوری طرح بیان کردیا گیا ہے آج کے دن تک جوحلال ہے وہ حلال ہی رہیگا اور جوحرام ہے وہ حرام رہے گا، حدوداللہ بھی بیان ہوچکی ہیں، جوامور فرض کیے گئے تھے وہی فرائض ہونگے، جواحکام بیان ہوچکے ہیں وہ حتمی ہیں، آج کے بعد ناسخ اور منسوخ کا ان میں کوئی احتمال نہیں، جو امور منصوص علیہا نہیں ہیں ان کے استخراج کیلئے قوانین اجتہاد بھی وضع کردیے گئے ہیں، آیہء کریمہ نے حلال، حرام، حدوداللہ، فرائض میں ترمیم یا اضافہ کا دروازہ تو قیامت تک کیلئے بند کردیا ہے، مگر اجتہاد اور قیاس کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، اگر اجتہاد اور قیاس سے مستنبط ہونے والے احکام بدعت ضلالۃ اور دین میں مداخلت شمار ہوتے تو اجتہاد کے دروازے کو نہی کے ذریعے مقفل کردیا جاتا، مگر آیہء کریمہ کے نزول کے بعد بھی صحابہ، تابعین، تبع تابعین نے غیر منصوص علیہا احکام کیلئے قرآن وسنت میں اجتہاد کیا، مولف کتابچہ فرمائیں کہ (الیوم اکملت لکم دینکم) سے مراد جمیع دین اسلام کی تکمیل مراد ہے یا اصول وقواعد کی؟ اگر من کل الوجوہ دین کی تکمیل مراد ہے جیسا کہ آپ نے کتابچہ کے صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱، پر تحریر کیا ہے تو حجۃ الوداع کے بعد جو اجتہادات ہوئے اوران کی بنیاد پر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی مذہب معرض وجود میں آئے، مداخلت فی الدین ہوئی، اورتمام اجتہادات بدعات ضلالۃ ہوئے، جب اجتہادات بدعات ضلالہ ہوئے

تو آئمہ مجتہدین اہل سنت و جماعت سے کس طرح ہوئے؟ اور ان کے مقلدین مسلمان کس طرح ہوئے؟ کتابچہ، ۱۰، ۱۱، پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے بہتان ہے اختراء ہے، کوئی مسلمان دین میں کمی رہ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ زبان سے کہے، امور حسنہ کی ترغیب اگر دی جاتی ہے تو حدیث من سن فی الاسلام سنة حسنة، ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن کی بنیاد پر دی جاتی ہے، اور یہ ہرگز مداخلت فی الدین نہیں، دین سے وہی امور مراد ہیں جن کا ذکر صاحب روح المعانی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے کیا ہے اور اگر حلال اور حرام، فرائض، حدود اللہ، اجتہاد وغیرہ کے اصول اور قواعد مراد ہیں تو ہمارا موقف درست اور مولف کتابچہ کی تقریر مندرجہ ص، ۱۰، غلط ہے اور اجتہادات مداخلت فی الدین نہیں بلکہ الیوم اکملت لکم دینکم کی متممات، مجوزات اور جزئیات تصور ہونگے، اگر اجتہادات مداخلت فی الدین ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین من سن فی الاسلام سنة حسنة (الحدیث) ما راه المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن،، کا کیا مقصد ہے؟ اور کس امر اور کس قوم کی طرف اشارہ ہے؟ حافظ ابن کثیر نے آیت مذکورہ کے تحت نقل فرمایا ہے: "فلا حلال الا ما احله، ولا حرام الا ما حرمه ولا دین، الا ما شرعه" (ابن کثیر) حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال فرمایا اور حرام وہی ہے جس کو اللہ نے حرام فرمایا اور دین وہی ہے جس کو اللہ نے واضح فرمایا،

مفسر کی تفسیر سے ثابت ہوا کہ تکمیل دین سے مراد، عقائد، فرائض اور حدود اللہ کی تکمیل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حلال وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا، اور حرام کی حرمت وہاں تک ہے جہاں تک اللہ نے بیان کی ہے، دین وہی ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی شکل میں ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعلیم دی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریعی اور تشریحی عمل میں اجتہاد بھی داخل ہے، اجتہادی مسائل امور شرعیہ ہیں، اجتہادی، فقہی مسائل کا انکار دین کے ایک قابل قدر حصے کا انکار ہے ہر حکم کتاب وسنت میں مذکورہ نہیں بلکہ بعض مسائل کا حکم اجتہاد

سے بھی ثابت ہوتا ہے اس کیلئے حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ احادیث میں موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا تمہارے فیصلہ کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ عرض کیا کتاب اللہ سے فیصلہ کرونگا فرمایا وہاں حکم نہ پاسکے تو عرض کیا سنت رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ دونگا، فرمایا اگر حکم یا اس کی نظیر سنت رسول ﷺ میں نہ پاؤ، تو عرض کیا میں اجتہاد کروں گا، رسول الہ ﷺ نے تائید فرماتے ہوئے اور اظہار مسرت کے طور پر حضرت معاذ بن جبل کے سینے پر ہاتھ پھیرا، اور اللہ کی حمد بیان کی، واقعہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر حکم قرآن میں ہے نہ سنت میں، ہر بات پر قرآن وسنت سے ثبوت مانگنا بھی فرمان رسول ﷺ کے خلاف ہے، یہی واقعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اجتہاد کرنا منشائے رسول ﷺ کے عین مطابق ہے، اگر ہر معاملے کا حکم سنت میں ہوتا یا سنت سے ثابت کرانا ضروری ہوتا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کی اجازت کیوں دی جاتی؟ اجتہاد کی بصیرت اور توفیق اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام ہے جو ہر کس وناکس کو نہیں دیا جاتا، اس کا تعلق صرف اور صرف من یرد اللہ بہ خیرا (الحدیث) کے ساتھ ہے، اذان برقبر بھی علماء متاخرین کا ایک اجتہاد ہے اور اذان برقبر کو امر قیاسی کہا گیا ہے، محقق رملی کے مطابق اذان برقبر شافعی علماء کے نزدیک سنت ہے، بالفرض اگر سنت نہ ہو، بدعت ہی ہو تو بھی یہ بدعت ضلالہ نہیں، بدعت ضلالۃ کی تعریف آئمہ محدثین، فقہاء بلکہ خود حدیث رسول ﷺ سے بیان ہو چکی ہے، تکرار بے مقصد ہے، علمائے امت کی تحقیق، ضابطہ کے تحت فرمودات میں اختلاف مداخلت فی الدین نہیں بلکہ دین کے ہی اعتبارات اور انکشافات ہین کسی کے تسلیم نہ کرنے سے انکی شرعی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی لیکن انصاف کا تقاضہ ہے کہ شرعی معاملات کو شرعی اصول وقواعد کی کسوٹی پر پرکھا جائے ذاتی رائے اور انفرادی سوچ کو معیار حقانیت نہ بنایا جائے،،

علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا مجتہد کے مذہب کی بنیاد خبر صحیح ہے اور وہ خبر صحیح جس کے

معارض کوئی اور خبر صحیح نہ ہو،

اذان برقبر کی اصل وہ اذان ہے جو اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صاحب قبر کے کان میں بعد ازولادت دی گئی تھی ، اسی اذان کی بنیاد پر اسی شخص کی افادیت کیلئے قبر پر اذان دی گئی ، بوقت اذان وہ وصف حیات سے متصف ہے یہ الگ بات ہے، حیات برزخی حیات دنیاوی سے مختلف اور قابل احساس نہیں ہے،

غور کا مقام ہے کہ اگر ہر حکم قرآن وسنت میں موجود ہوتا اور اس سے مسائل کا اخذ کرنا ہر کس وناکس کیلئے ممکن ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دومرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فان لم تجد سے کیوں خطاب فرماتے ؟ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی استنباط کی توفیق پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ:" الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" تمام تعریفات اللہ ہی کیلئے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب کو اس چیز کی توفیق عطاء فرمائی ہے جس چیز کو اللہ کے رسول پسند فرماتے ہیں،،

معلوم ہوا فقہائے امت کی فقہی کاوشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حد درجہ پسند ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی توفیقات ہیں ، اذان برقبر ایک فقہی مسئلہ ہے جس کو فقہاء نے اذان بعد از ولادت پر قیاس کرتے ہوئے استخراج کیا ہے، اس کی اصل اور سند اذان نومولود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ثابت ہے اور بطریق تواتر آج تک امت مسلمہ میں چلی آرہی ہے مسائل کا استنباط اور استخراج کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب ہیں، ان پر لعن کرنا اور تنقیدی گفتگو کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا ، بالخصوص ایسے فقہائے کرام جن کو دنیائے علم وفضل پر حکمرانی اور شہنشاہیت کا منصب ملا ہو، ان کی تصانیف اور ان کے قلمی شاہکار امت مسلمہ کیلئے حرف آخر اور سرمایہ حیات کا درجہ رکھتے ہوں، علامہ خیر الدین الرملی جنہوں نے فرمایا کہ شافعی علماء کی کتب میں میں نے اذان برقبر کو سنت لکھا دیکھا ہے، یہ حاشیہ بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں تحریر فرمایا،

سے بھی ثابت ہوتا ہے اس کیلئے حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ احادیث میں موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا تمہارے فیصلہ کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ عرض کیا کتاب اللہ سے فیصلہ کرونگا فرمایا وہاں حکم نہ پاسکے تو عرض کیا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیصلہ دونگا، فرمایا اگر حکم یا اس کی نظیر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہ پاؤ، تو عرض کیا میں اجتہاد کروں گا، رسول الہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تائید فرماتے ہوئے اور اظہار مسرت کے طور پر حضرت معاذ بن جبل کے سینے پر ہاتھ پھیرا، اور اللہ کی حمد بیان کی، واقعہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر حکم قرآن میں ہے نہ سنت میں، ہر بات پر قرآن وسنت سے ثبوت مانگنا بھی فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہے، یہی واقعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اجتہاد کرنا منشائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عین مطابق ہے، اگر ہر معاملے کا حکم سنت میں ہوتا یا سنت سے ثابت کرانا ضروری ہوتا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کی اجازت کیوں دی جاتی؟ اجتہاد کی بصیرت اور توفیق اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام ہے جو ہر کس وناکس کو نہیں دیا جاتا، اس کا تعلق صرف اور صرف من یرد اللہ بہ خیرا (الحدیث) کے ساتھ ہے، اذان برقبر بھی علماء متاخرین کا ایک اجتہاد ہے اور اذان برقبر کو امر قیاسی کہا گیا ہے، محقق رملی کے مطابق اذان برقبر شافعی علماء کے نزدیک سنت ہے، بالفرض اگر سنت نہ ہو، بدعت ہی ہو تو بھی یہ بدعت ضلالۃ نہیں، بدعت ضلالۃ کی تعریف آئمہ محدثین، فقہاء بلکہ خود حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان ہو چکی ہے، تکرار بے مقصد ہے، علمائے امت کی تحقیق، ضابطہ کے تحت فرمودات میں اختلاف مداخلت فی الدین نہیں بلکہ دین کے ہی اعتبارات اور انکشافات ہین کسی کے تسلیم نہ کرنے سے انکی شرعی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی لیکن انصاف کا تقاضہ ہے کہ شرعی معاملات کو شرعی اصول وقواعد کی کسوٹی پر پرکھا جائے ذاتی رائے اور انفرادی سوچ کو معیار حقانیت نہ بنایا جائے،،

علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا مجتھد کے مذہب کی بنیاد خبر صحیح ہے اور وہ خبر صحیح جس کے

معارض کوئی اور خبر صحیح نہ ہو،

اذان برقبر کی اصل وہ اذان ہے جو اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صاحب قبر کے کان میں بعد ازولادت دی گئی تھی، اسی اذان کی بنیاد پر اسی شخص کی افادیت کیلئے قبر پر اذان دی گئی، بوقت اذان وہ وصف حیات سے متصف ہے یہ الگ بات ہے، حیات برزخی حیات دنیاوی سے مختلف اور قابل احساس نہیں ہے،

غور کا مقام ہے کہ اگر ہر حکم قرآن وسنت میں موجود ہوتا اور اس سے مسائل کا اخذ کرنا ہر کس وناکس کیلئے ممکن ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فان لم تجد سے کیوں خطاب فرماتے؟ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی استنباط کی توفیق پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ: ''الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' تمام تعریفات اللہ ہی کیلئے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب کو اس چیز کی توفیق عطاء فرمائی ہے جس چیز کو اللہ کے رسول پسند فرماتے ہیں،،

معلوم ہوا فقہائے امت کی فقہی کاوشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حد درجہ پسند ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی توفیقات ہیں، اذان برقبر ایک فقہی مسئلہ ہے جس کو فقہاء نے اذان بعد از ولادت پر قیاس کرتے ہوئے استخراج کیا ہے، اس کی اصل اور سند اذان نومولود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ثابت ہے اور بطریق تواتر آج تک امت مسلمہ میں چلی آرہی ہے مسائل کا استنباط اور استخراج کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب ہیں، ان پر لعن کرنا اور تنقیدی گفتگو کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا، بالخصوص ایسے فقہائے کرام جن کو دنیائے علم وفضل پر حکمرانی اور شہنشاہیت کا منصب ملا ہو، ان کی تصانیف اور ان کے قلمی شاہکار امت مسلمہ کیلئے حرف آخر اور سرمایہ حیات کا درجہ رکھتے ہوں، علامہ خیر الدین الرملی جنہوں نے فرمایا کہ شافعی علماء کی کتب میں میں نے اذان برقبر کو سنت لکھا دیکھا ہے، یہ حاشیہ بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں تحریر فرمایا،

علامہ شامی نے ردالمختار میں انکے حوالے سے اذان برقبر کو سنت لکھا، علامہ خیرالدین رملی کی شان دیکھنی ہوتو درمختار دیکھیں، مزید دیکھنی ہوتو ردالمختار دیکھیں، علامہ شامی نے ان کی جلالت علمی کا اعتراف کیاہےاور کن الفاظ کے ساتھ ان کے حضور خراج عقیدت پیش کیاہے،، قصر علم وعرفان کی چوٹی پر جس پیکر تحقیق کی شوک علمی کا پرچم صدیوں سے لہرارہاہے اس کے متعلق یہ لکھنا کہ آپکے رملی صاحب حصہ علم سے نابلد ہونیکی دلیل ہے، علامہ ہمارے ہیں، شیخ الشیوخ ہیں، شیخ الاحناف ہیں، امت حنفیہ کے مقتداء اور پیشوا ہیں، فیضان خداوندی کے مظہر، علوم حدیث کے ترجمان ہیں، علوم دینیہ اور کسبیہ کے جامع ہیں اگر ان کی شخصیت کسی کو نظر نہ آئے تو یہ دیکھنے والے کی آنکھوں کا قصور اور فتور ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ اشیاء کھالیتے اور کچھ چھوڑ دیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی، جس میں حلال اشیاء کو حلال اور حرام اشیاء کو حرام فرمادیا: ''وما سکت عنہ فھو عفو'' (ابوداؤد)

اور جن کے بارے میں سکوت فرمایا وہ درجہ عفو میں ہیں یعنی مباح ہیں،،

ثابت ہوا کہ کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت فرمایا ان کے حلال، حرام، جائز یا ناجائز ہونے پر کچھ بھی ارشاد نہیں فرمایا، مفسر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو مباح فرمایا، اور ان کے ارتکاب کو قابل معافی قرار دیا، احناف اور شوافع اس بات پر متفق ہیں کہ اشیاء میں اصل اباحت ہی ہے، یعنی ہر چیز اصل میں مباح ہے، اس کی قدرے تفصیل راقم الحروف نے اپنے رسالہ مسئلہ اذان برقبر کے ص، ۲۴، پر پیش کردی ہے ،اعادہ کرنا ضروری نہیں، اذان برقبر امر مباح ہے، اس کی حرمت اور عدم جوازیت پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں، جن احادیث کا مولف کتابچہ نے سہارا لیکر اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ ثابت کرنیکی سعی ناتمام کی ہے،

ان کی معنوی اور تفسیری حقیقت آئمہ محدثین اور فقہائے امت کی تصریحات سے ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، اور یہ ثابت کر چکے احادیث مبارکہ کے معنی، مطالب اور مصداق وہ نہیں جو مولف کتابچہ نے اخذ کیے ہیں، راقم الحروف نے احادیث، اقوال فقہاء اور قواعد وضوابط کے تحت اذان برقبر کو ثابت کیا ہے، مولف کتابچہ کسی قول، قاعدے اور اصول کو نقلی دلائل سے رد نہیں کر سکے، من پسند تقریر یا تحریر کو رد نہیں کہا جاسکتا، دلیل کے مقابل دلیل لاکر مدعائے مخالف کی نفی کا نام تردید ہے، مولف کتابچہ کوئی ہم مسلک، ہم مشرب، سلیس اور شستہ انداز کو تردید کہتا ہے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے، اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، راقم اہل علم حضرات سے یہ گزارش کرتا ہے کہ ہر دو متضاد موقف پر مبنی تحریرات کا موازنہ کیا جائے بحمد اللہ مسئلہ اذان برقبر میں تمام نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں اگر تردید لانسلم کا نام ہے تو ہمیں بھی تسلیم ہے،

گزارش یہ کر رہا تھا کہ اذان برقبر امر مباح ہے امر مباح کے متعلق فقہاء کا اصول یہ ہے کہ اگر بغرض حصول ثواب اس کو دیا جائے تو وہ عبادت کا درجہ پالیتا ہے، اور عبادت کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا:

"والعبادة مايثاب عليه ويتوقف على نيته" (ردالمختار، ص، ۱۰۴)

عبادت کرنے پر ثواب ملتا ہے اور عبادت کیلئے نیت شرط ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کرنے سے ثواب ملتا ہے اور عبادت ہونے کیلئے نیت شرط ہے، اذان برقبر امر مباح ہے جب بغرض حصول ثواب دی گئی تو عبادت کا درجہ پاگئی، اور مفید ثواب بھی ہوئی، جبکہ امر ضلالۃ کا ارتکاب گناہ اور موجب عذاب ہے ثواب، عبادت اور ضلالہ میں تضاد اور تباین ہے ایک دوسرے پر ان کا اطلاق کیسے درست ہے؟

ملا جیون علیہ الرحمہ نے مباح کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: "والاباحة جواز الفعل مع جواز الترک" (نورالانوار، ص، ۲۹)

علامہ شامی نے ردالمختار میں انکے حوالے سے اذان برقبر کوسنت لکھا، علامہ خیر الدین رملی کی شان دیکھنی ہوتو درمختار دیکھیں، مزید دیکھنی ہوتو ردالمختار دیکھیں، علامہ شامی نے ان کی جلالت علمی کا اعتراف کیا ہے اور کن الفاظ کے ساتھ ان کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے،، قصر علم وعرفان کی چوٹی پر جس پیکر تحقیق کی شوک علمی کا پرچم صدیوں سے لہرا رہا ہے اس کے متعلق یہ لکھنا کہ آپکے رملی صاحب حصہ علم سے نابلد ہونیکی دلیل ہے، علامہ ہمارے ہیں، شیخ الشیوخ ہیں، شیخ الاحناف ہیں، امت حنفیہ کے مقتداء اور پیشوا ہیں، فیضان خداوندی کے مظہر، علوم حدیث کے ترجمان ہیں، علوم دینیہ اور کسبیہ کے جامع ہیں اگر ان کی شخصیت کسی کو نظر نہ آئے تو یہ دیکھنے والے کی آنکھوں کا قصور اور فتور ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ اشیاء کھالیتے اور کچھ چھوڑ دیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی، جس میں حلال اشیاء کو حلال اور حرام اشیاء کو حرام فرمادیا: ''وما سکت عنہ فھو عفو'' (ابوداؤد)

اور جن کے بارے میں سکوت فرمایا وہ درجہ عفو میں ہیں یعنی مباح ہیں،،

ثابت ہوا کہ کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت فرمایا ان کے حلال، حرام، جائز یا ناجائز ہونے پر کچھ بھی ارشاد نہیں فرمایا، مفسر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو مباح فرمایا، اور ان کے ارتکاب کو قابل معافی قرار دیا، احناف اور شوافع اس بات پر متفق ہیں کہ اشیاء میں اصل اباحت ہی ہے، یعنی ہر چیز اصل میں مباح ہے، اس کی قدرے تفصیل راقم الحروف نے اپنے رسالہ مسئلہ اذان برقبر کے ص، ۲۴، پر پیش کردی ہے ، اعادہ کرنا ضروری نہیں، اذان برقبر امر مباح ہے، اس کی حرمت اور عدم جوازیت پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں، جن احادیث کا مولف کتابچہ نے سہارا لیکر اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ ثابت کرنیکی سعی ناتمام کی ہے،

ان کی معنوی اور تفسیری حقیقت آئمہ محدثین اور فقہائے امت کی تصریحات سے ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، اور یہ ثابت کر چکے احادیث مبارکہ کے معنی، مطالب اور مصداق وہ نہیں جو مولف کتابچہ نے اخذ کیے ہیں، راقم الحروف نے احادیث، اقوال فقہاء اور قواعد وضوابط کے تحت اذان برقبر کو ثابت کیا ہے، مولف کتابچہ کسی قول، قاعدے اور اصول کو نقلی دلائل سے رد نہیں کر سکے، من پسند تقریر یا تحریر کو رد نہیں کہا جاسکتا، دلیل کے مقابل دلیل لاکر مدعائے مخالف کی نفی کا نام تردید ہے، مولف کتابچہ کوئی ہم مسلک، ہم مشرب، سلیس اور شستہ انداز کو تردید کہتا ہے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے، اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، راقم اہل علم حضرات سے یہ گزارش کرتا ہے کہ ہر دو متضاد موقف پر مبنی تحریرات کا موازنہ کیا جائے بحمد اللہ مسئلہ اذان برقبر میں تمام نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں اگر تردید لانسلم کا نام ہے تو ہمیں بھی تسلیم ہے،

گزارش یہ کرر ہا تھا کہ اذان برقبر امر مباح ہے امر مباح کے متعلق فقہاء کا اصول یہ ہے کہ اگر بغرض حصول ثواب اس کو دیا جائے تو وہ عبادت کا درجہ پالیتا ہے، اور عبادت کی تعریف کرتے ہوئے علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا:

"والعبادة مایثاب علیہ ویتوقف علی نیتہ" (ردالمختار، ص، ۱۰۴)

عبادت کرنے پر ثواب ملتا ہے اور عبادت کیلئے نیت شرط ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کرنے سے ثواب ملتا ہے اور عبادت ہونے کیلئے نیت شرط ہے، اذان برقبر امر مباح ہے جب بغرض حصول ثواب دی گئی تو عبادت کا درجہ پاگئی، اور مفید ثواب بھی ہوئی، جبکہ امر ضلالۃ کا ارتکاب گناہ اور موجب عذاب ہے ثواب، عبادت اور ضلالہ میں تضاد اور تباین ہے ایک دوسرے پر ان کا اطلاق کیسے درست ہے؟

ملا جیون علیہ الرحمہ نے مباح کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: "والاباحة جواز الفعل مع جواز الترک" (نورالانوار، ص، ۲۹)

مباح وہ امر ہے جس کا کرنا بھی جائز اور اس کا ترک بھی جائز ہے،،

پہلے گزر چکا ہے کہ جمہور شوافع اور احناف کے نزدیک اشیاء میں اصل اباحت ہے یعنی ان کا کرنا بھی جائز اور نہ کرنا بھی جائز ہے، یعنی اگر کر دیا جائے اور ثواب کی امید پر کیا جائے تو ممنوع نہیں اور اگر ترک کیا گیا تو باعث ملامت نہیں، فقہاء کے نزدیک جوامر جائز ہے، مفید ہے بدوں دلیل شرعی اس پر ممانعت، حرمت یا عدم جوازیت کا حکم نافذ کرنا اصول فقہہ کے منافی ہے اذان بر قبر امر مباح ہے جائز ہے مفید ثواب وطمانیت ہے بدوں دلیل شرعی اس پر بدعت ضلالۃ کا حکم چسپاں کرنا فقہ اور اس کے اصولوں سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، فقہائے کرام کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اذان بر قبر کو بدعت ضلالۃ جو حرام ہے کہنا غلط ہے بلکہ یہ عمل جائز ہے اور باعث اجر وثواب ہے، نماز کے علاوہ جن مقامات پر اذان دینا سنت ہے ان کا اجمال یہ ہے ، بچے ، مغموم ، مرگی کے دورے ، غضبناک ، بداخلاق ، بدخلق حیوان کے کان میں اذان دینا بھی سنت کہا گیا ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان مقامات پر مناسب حال اذان موثر ہے اور مناسب مقام اس کی تاثیر روحانی موجود ہے، ورنہ اذان دینا بے مقصد اور غیر مفید ہوتا اور فقہائے کرام علی الاعلان اتنا بڑا اعلان نہ فرماتے مذکورہ بالا مقامات پر پیش آنے والے حالات کا اجتماع تقریباً میت کیلئے قبر میں ہو رہا ہے، قبر پر دی جانے والی اذان یقیناً اس کیلئے مفید ہے، اذان کی برکات کا تو یہ عالم ہے کہ سرکش جنات اور حیوانات کی فطرت اور جبلت بھی بدل دیتی ہے، اور مائل بہ اصلاح کرتی ہے، قبر میں لیتا ہوا انسان اتنا گیا گزرا ہے کہ وہ آواز اذان سن کر بھی جوابات کی اصلاح نہیں کر سکتا؟ اگر بعد از دفن تلقین کے روپ میں اے فلاں بن فلاں تو اس دین کو یاد کر دنیا میں تو جس دین کا پیرو کار تھا آلاخر، سن کر دین کو یاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کیا کلمات اذان سن کر اس کو اتنا بھی یاد نہیں آئیگا کہ میرا دین اسلام ہے، میرا وہی دین ہے جس کی علامت اور شناخت نمازوں کیلئے اذان دینا بھی ہے ملاحظہ فرمایئے زندوں کو قبر میں رکھے ہوئے میت کیلئے

دعا، استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مشکوۃ شریف کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد از دفن میت کیلئے صحابہ کرام کو حکم فرمایا کہ وہ اپنے مسلمان بھائی جو قبر میں ہے کیلئے ثابت قدم رہنے کیلئے دعا کریں، ثابت قدم رہنے کیلئے دعا کا حکم دیا جانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ میت کیلئے حالات برزخ معمول کے مطابق اور قابل رشک نہیں ہوتے، میت انتہائی کشیدہ ماحول میں گری ہوئی ہے، دعا، استغفار، تلقین اذان، تلاوت قرآن پاک یہ تمام چیزیں مفید اور باعث تسکین ہوتی ہیں، مولف کتابچہ نے ابن حجر کے قول کہ اذان بر قبر بدعت ہے کو بہت اچھالا ہے اور راقم پر دباؤ ڈالا کہ وہ ابن حجر کی بات کو مان لیں، کتابچہ، ص، ۳۰، ابن حجر نے اپنی کتاب تحفہ مین نقل فرمایا کہ مسافر آدمی کیلئے اذان اور اقامت کہنا دونوں سنت ہیں،

علامہ شامی نے نقل فرمایا کہ: ”وزاد ابن حجر فی التحفة الاذان والاقامة خلف المسافر ،قالا المدنی قال وزاد فی شرعة الاسلام لمن ضل الطریق فی ارض قفر“

امام ابن حجر نے تحفہ میں مسافر کے پیچھے اذان اور اقامت کا کہنا بھی سنت کہا ہے امام مدنی نے کتاب شرعۃ الاسلام میں کہا ہے کہ اگر کوئی ویران جگہ میں راستہ بھول جائے تو اس کیلئے بھی اذان دینا سنت ہے،،

ابن حجر نے مسافر کیلئے اذان اور اقامت کہنا سنت کہا ہے جبکہ فقہائے احناف کا اس میں اختلاف ہے، چٹیل ویرانے میں اذان دینے کا مقصد راستہ کی راہ بری ہے،، صحیح سمت کی راہنمائی مقصود ہے، یقیناً یہ فوائد ان مقامات پر اذان دینے سے حاصل ہوتے ہیں، کیا وجہ ہے ؟اور کیا امر مانع ہے کہ قبر پر اذان دینے سے بندہ مومن کی قبر میں صحیح جوابات کی راہنمائی نہ فرمائے، دنیا میں بھی ویرانہ اور اجنبیت ہے، قبر میں بھی ویرنگی اور اجنبیت ہے، گو دنیا اور برزخ کا فرق ضرور ہے مگر اذان وہی، تاثیر وہی، مقصود بھی وہی ہے، دنیا میں تو موثر ہے مگر قبر مین موثر نہیں، یہ کہنا خلاف عقل اور نقل ہے، علامہ شامی نے مذکورہ مقامات پر اذان دینے کے سنت

مباح وہ امر ہے جس کا کرنا بھی جائز اور اس کا ترک بھی جائز ہے،،

پہلے گزر چکا ہے کہ جمہور شوافع اور احناف کے نزدیک اشیاء میں اصل اباحت ہے یعنی ان کا کرنا بھی جائز اور نہ کرنا بھی جائز ہے، یعنی اگر کر دیا جائے اور ثواب کی امید پر کیا جائے تو ممنوع نہیں اور اگر ترک کیا گیا تو باعث ملامت نہیں، فقہاء کے نزدیک جوامر جائز ہے، مفید ہے بدوں دلیل شرعی اس پر ممانعت، حرمت یا عدم جوازیت کا حکم نافذ کرنا اصول فقہہ کے منافی ہے اذان بر قبر امر مباح ہے جائز ہے مفید ثواب وطمانیت ہے بدوں دلیل شرعی اس پر بدعت ضلالۃ کا حکم چسپاں کرنا فقہ اور اس کے اصولوں سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، فقہائے کرام کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اذان بر قبر کو بدعت ضلالۃ جو حرام ہے کہنا غلط ہے بلکہ یہ عمل جائز ہے اور باعث اجر وثواب ہے، نماز کے علاوہ جن مقامات پر اذان دینا سنت ہے ان کا اجمال یہ ہے ، بچے، مغموم، مرگی کے دورے، غضبناک، بداخلاق، بدخلق حیوان کے کان میں اذان دینا بھی سنت کہا گیا ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان مقامات پر مناسب حال اذان موثر ہے اور مناسب مقام اس کی تاثیر روحانی موجود ہے، ورنہ اذان دینا بے مقصد اور غیر مفید ہوتا اور فقہائے کرام علی الاعلان اتنا بڑا اعلان نہ فرماتے مذکورہ بالا مقامات پر پیش آنے والے حالات کا اجتماع تقریباً میت کیلئے قبر میں ہو رہا ہے، قبر پر دی جانے والی اذان یقیناً اس کیلئے مفید ہے، اذان کی برکات کا تو یہ عالم ہے کہ سرکش جنات اور حیوانات کی فطرت اور جبلت بھی بدل دیتی ہے، اور مائل بہ اصلاح کرتی ہے، قبر میں لیٹا ہوا انسان اتنا گیا گزرا ہے کہ وہ آواز اذان سن کر بھی جوابات کی اصلاح نہیں کر سکتا؟ اگر بعد از دفن تلقین کے روپ میں اے فلاں بن فلاں تو اس دین کو یاد کر دنیا میں تو جس دین کا پیروکار تھا آلاخر، سن کر دین کو یاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کیا کلمات اذان سن کر اس کو اتنا بھی یاد نہیں آئیگا کہ میرا دین اسلام ہے، میرا وہی دین ہے جس کی علامت اور شناخت نمازوں کیلئے اذان دینا بھی ہے ملاحظہ فرمائیے زندوں کو قبر میں رکھے ہوئے میت کیلئے

دعا، استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مشکوۃ شریف کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد از دفن میت کیلئے صحابہ کرام کو حکم فرمایا کہ وہ اپنے مسلمان بھائی جو قبر میں ہے کیلئے ثابت قدم رہنے کیلئے دعا کریں، ثابت قدم رہنے کیلئے دعا کا حکم دیا جانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ میت کیلئے حالات برزخ معمول کے مطابق اور قابل رشک نہیں ہوتے، میت انتہائی کشیدہ ماحول میں گری ہوئی ہے، دعا، استغفار، تلقین اذان، تلاوت قرآن پاک یہ تمام چیزیں مفید اور باعث تسکین ہوتی ہیں، مولف کتابچہ نے ابن حجر کے قول کہ اذان بر قبر بدعت ہے کو بہت اچھالا ہے اور راقم پر دباؤ ڈالا کہ وہ ابن حجر کی بات کو مان لیں، کتابچہ، ص، ۳۰، ابن حجر نے اپنی کتاب تحفہ مین نقل فرمایا کہ مسافر آدمی کیلئے اذان اور اقامت کہنا دونوں سنت ہیں،

علامہ شامی نے نقل فرمایا کہ: ''وزاد ابن حجر فی التحفة الاذان والاقامة خلف المسافر ،قالا المدنی قال وزاد فی شرعة الاسلام لمن ضل الطریق فی ارض قفر''

امام ابن حجر نے تحفہ میں مسافر کے پیچھے اذان اور اقامت کا کہنا بھی سنت کہا ہے امام مدنی نے کتاب شرعة الاسلام میں کہا ہے کہ اگر کوئی ویران جگہ میں راستہ بھول جائے تو اس کیلئے بھی اذان دینا سنت ہے،،

ابن حجر نے مسافر کیلئے اذان اور اقامت کہنا سنت کہا ہے جبکہ فقہائے احناف کا اس میں اختلاف ہے، چٹیل ویرانے میں اذان دینے کا مقصد راستہ کی راہ بری ہے،، صحیح سمت کی راہنمائی مقصود ہے، یقیناً یہ فوائد ان مقامات پر اذان دینے سے حاصل ہوتے ہیں، کیا وجہ ہے ؟اور کیا امر مانع ہے کہ قبر پر اذان دینے سے بندہ مومن کی قبر میں صحیح جوابات کی راہنمائی نہ فرمائے، دنیا میں بھی ویرانہ اور اجنبیت ہے، قبر میں بھی ویرنگی اور اجنبیت ہے، گو دنیا اور برزخ کا فرق ضرور ہے مگر اذان وہی، تاثیر وہی، مقصود بھی وہی ہے، دنیا میں تو موثر ہے مگر قبر مین موثر نہیں، یہ کہنا خلاف عقل اور نقل ہے، علامہ شامی نے مذکورہ مقامات پر اذان دینے کے سنت

ہونے کو تسلیم کیا ہے مگر تنویر الابصار اور درمختار نے سنت ہونے کی نفی کی ہے ،فرمایا: لایسن لغیرھا" نماز پنجگانہ کے علاوہ کسی نماز اور کسی جگہ اذان دینا سنت نہیں،

صاحب متن اور شارح دونوں حنفی المذہب ہیں مگر سنت اذان پر ان کے درمیان اختلاف ہے ،کیا ان کو حنفی المذہب نہیں کہا جائیگا؟ امام ابن حجر شافعی المذہب ہیں ،فقہائے احناف اور ان کے درمیان اذان بر قبر کے سنت ہونے پر اختلاف ہے کیا اس اختلاف کی بنیاد پر امام ابن حجر ،فقہائے احناف کو اہل سنت و جماعت سے خارج کر دیا جائیگا، آئمہ اربعہ کے اجتہادات باہم مختلف ہیں ،کیا وہ اہل سنت و جماعت نہیں ،امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا تقریباً ہر فقہی مسئلہ میں اختلاف ہے کیا اس اختلاف کے کرنے پر صاحبین آئمہ احناف نہیں رہیں گے،مولف کتابچہ کو علم ہونا چاہیے کہ سنی العقیدہ ہونا یا نہ ہونا عقائد و نظریات کی بناء پر ہے، فقہی آراء فروعات کہلاتی ہیں ان میں اختلاف کرنا یا اختلاف کا پایا جانا اہل سنت و جماعت ہونے کیلیئے امر مانع نہیں ہے ،اذان بر قبر کی مشروعیت پر علامہ ابن عابدین الشامی کے الفاظ یہ ہیں :"وقیل عند انزال المیت القبر قیاسا علی اول خروجه للدنیا"

یعنی اذان بر قبر کو اذان بعد از ولادت پر قیاس کرتے ہوئے سنت کہا گیا ہے،

مولف کتابچہ کو اس بات پر ناراضگی ہوئی کہ قیاس اور پھر ایک آدمی کا قیاس اس کی کیا حیثیت ہے ؟ص ،۱۳۷ اگر مولف کتابچہ اصول فقہ سے واقف ہوتے تو جلد بازی کرتے ہوئے بلا سوچے سمجھے یوں نہ کہتے ؟ کنز الدقائق کے مصنف علامہ ابوالابرکات النسفی رسالہ منار میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اعلم ان اصول الشرع ثلثة الکتاب والسنة واجماع الامة والاصل الرابع القیاس"

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کے تین اصول ہیں ،کتاب سنت ،اجماع امت اور چوتھا اصول قیاس ہے،

اصول فقہ کے تمام متون اور شروح میں قیاس کو اصول شریعت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا قیاس دلیل شرعی ہے، ملا جیون نے نور الانوار میں فرمایا کہ قیاس کا مبنی اور ماخذ کتاب سنت اور اجماع امت ہیں،

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تین دلائل قطعیہ اور قیاس دلیل ظنی کے حکم میں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قیاس کی علت کوئی امر منصوص نہ ہو، اگر علت منصوص ہوئی تو وہ بھی مفید دلیل قطعی ہوگا،

جیسا کہ اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے، جب یہ امر مسلمہ ہے کہ قیاس دلیل شرعی ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو حکم قیاس سے ثابت ہوگا وہ شرعی اور لائق عمل قرار پائے گا، ممنوع یا مذموم نہیں ہوگا، اذان بر قبر کی مشروعیت کی علت اذان بعد از ولادت ہے، یعنی یہ وہی شخص ہے، دنیا میں آمد کے وقت اس کے کان میں اذان دی گئی تھی، اور وہ اذان سنت کی روشنی میں تھی، اب یہ شخص قبر میں چلا گیا ہے، خیر و برکت کیلئے قبر پر اذان دینا بھی اس طرح ہے جس طرح بوقت ولادت خیر و برکت کیلئے اس کے کان میں اذان دی گئی تھی، جب اذان بر قبر قیاس سے ثابت ہے تو قیاس سے ثابت ہونے والا حکم بھی لا محالہ شرعی ہوگا، ممنوع، مذموم یا ضلالت ہر گز نہیں ہوسکتا مولف کتابچہ کا اذان بر قبر کو بدعت ضلالۃ کہنا فقہ کے مطابق غلط اور لغو ہے، صاحب علم کیلئے مزید تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے،

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن معاذ دفن ہو چکے اور قبر کو درست کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر پر دیر تک سبحان اللہ، سبحان اللہ اور پھر اللہ اکبر، اللہ اکبر پڑھتے رہے صحابہ کرام بھی آپ کی اتباع اور اقتداء میں پڑھتے رہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے اتنی دیر تک تسبیح و تکبیر کیوں پڑھی ہے؟ فرمایا اس مرد صالح پر قبر تنگ ہوگئی تھی میں نے تسبیح اور تکبیر پڑھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قبر کو کشادہ فرمایا، ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں فرمایا کہ: "اھتز عرش الرحمن لموتہ" اللہ کا عرش ان کی

ہونے کو تسلیم کیا ہے مگر تنویر الابصار اور درمختار نے سنت ہونے کی نفی کی ہے ،فرمایا: لایسن لغیرھا" نماز پنجگانہ کے علاوہ کسی نماز اور کسی جگہ اذان دینا سنت نہیں،

صاحب متن اور شارح دونوں حنفی المذہب ہیں مگر سنت اذان پر ان کے درمیان اختلاف ہے ،کیا ان کو حنفی المذہب نہیں کہا جائیگا؟ امام ابن حجر شافعی المذہب ہیں ،فقہائے احناف اور ان کے درمیان اذان برقبر کے سنت ہونے پر اختلاف ہے کیا اس اختلاف کی بنیاد پر امام ابن حجر ،فقہائے احناف کو اہل سنت و جماعت سے خارج کردیا جائیگا، آئمہ اربعہ کے اجتہادات باہم مختلف ہیں ،کیا وہ اہل سنت و جماعت نہیں ،امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا تقریباً ہر فقہی مسئلہ میں اختلاف ہے کیا اس اختلاف کے کرنے پر صاحبین آئمہ احناف نہیں رہیں گے،مولف کتابچہ کو علم ہونا چاہیے کہ سنی العقیدہ ہونا یا نہ ہونا عقائد ونظریات کی بناء پر ہے، فقہی آراء فروعات کہلاتی ہیں ان میں اختلاف کرنا یا اختلاف کا پایا جانا اہل سنت و جماعت ہونے کیلیئے امر مانع نہیں ہے ،اذان برقبر کی مشروعیت پر علامہ ابن عابدین الشامی کے الفاظ یہ ہیں: "وقیل عند انزال المیت القبر قیاسا علی اول خروجہ للدنیا"

یعنی اذان برقبر کو اذان بعد از ولادت پر قیاس کرتے ہوئے سنت کہا گیا ہے،

مولف کتابچہ کو اس بات پر ناراضگی ہوئی کہ قیاس اور پھر ایک آدمی کا قیاس اس کی کیا حیثیت ہے ؟ص،۱۳۷ اگر مولف کتابچہ اصول فقہ سے واقف ہوتے تو جلد بازی کرتے ہوئے بلا سوچے سمجھے یوں نہ کہتے ؟ کنز الدقائق کے مصنف علامہ ابوالابرکات النسفی رسالہ منار میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اعلم ان اصول الشرع ثلثة الکتاب والسنة واجماع الامة والاصل الرابع القیاس"

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کے تین اصول ہیں ،کتاب سنت ،اجماع امت اور چوتھا اصول قیاس ہے،

اصول فقہ کے تمام متون اور شروح میں قیاس کو اصول شریعت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا قیاس دلیل شرعی ہے، ملا جیون نے نور الانوار میں فرمایا کہ قیاس کا مبنی اور ماخذ کتاب وسنت اور اجماع امت ہیں،

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تین دلائل قطعیہ اور قیاس دلیل ظنی کے حکم میں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قیاس کی علت کوئی امر منصوص نہ ہو، اگر علت منصوص ہوئی تو وہ بھی مفید دلیل قطعی ہوگا،

جیسا کہ اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے، جب یہ امر مسلمہ ہے کہ قیاس دلیل شرعی ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو حکم قیاس سے ثابت ہوگا وہ شرعی اور لائق عمل قرار پائے گا، ممنوع یا مذموم نہیں ہوگا، اذان بر قبر کی مشروعیت کی علت اذان بعد از ولادت ہے، یعنی یہ وہی شخص ہے، دنیا میں آمد کے وقت اس کے کان میں اذان دی گئی تھی، اور وہ اذان سنت کی روشنی میں تھی، اب یہ شخص قبر میں چلا گیا ہے، خیر وبرکت کیلئے قبر پر اذان دینا بھی اس طرح ہے جس طرح بوقت ولادت خیر وبرکت کیلئے اس کے کان میں اذان دی گئی تھی، جب اذان بر قبر قیاس سے ثابت ہے تو قیاس سے ثابت ہونے والا حکم بھی لامحالہ شرعی ہوگا، ممنوع، مذموم یا ضلالت ہر گز نہیں ہوسکتا، مولف کتابچہ کا اذان بر قبر کو بدعت ضلالۃ کہنا فقہ کے مطابق غلط اور لغو ہے، صاحب علم کیلئے مزید تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے،

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن معاذ دفن ہو چکے اور قبر کو درست کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر پر دیر تک سبحان اللہ، سبحان اللہ اور پھر اللہ اکبر، اللہ اکبر پڑھتے رہے صحابہ کرام بھی آپ کی اتباع اور اقتداء میں پڑھتے رہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے اتنی دیر تک تسبیح وتکبیر کیوں پڑھی ہے؟ فرمایا اس مرد صالح پر قبر تنگ ہوگئی تھی میں نے تسبیح اور تکبیر پڑھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قبر کو کشادہ فرمایا، ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں فرمایا کہ: "اهتز عرش الرحمن لموته" اللہ کا عرش ان کی

موت پر فرط مسرت سے جھوم اٹھا تھا،،

یہ حدیث ایک طرف حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شان بیان کرتی ہے اور دوسری طرف تنگی قبر اور شدید ابتلاء اور آزمائش کی خبر بھی دیتی ہے اسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایسی کیفیت اور حالت میں اذکار الٰہی میں موثر ترین وہ ذکر ہے جس سے اللہ کی توحید، بڑائی اور تقدیس کا برملا اظہار ہوتا ہے اذان ان صفات پر مشتمل اور ان کی جامع ہے، قبر پر اذان دینا یقیناً میت کیلئے سکون ذکر الٰہی، ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ ہونے کی بدولت اذان دینا کیوں بدعت ضلالۃ ہے؟

سبحان اللہ، اللہ اکبر کا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ثابت ہے گویا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے حضرت سعد بن معاذ کی قبر پر فرمایا، مگر حضرت عمرو بن العاص صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں بوقت وفات اپنے بیٹے کو یہ وصیت فرماتے ہیں کہ جب میرا جنازہ اٹھے تو آگ اور کوئی رونے چیخنے والا ہمراہ نہ ہو، قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد جلدی سے چلے نہ جانا، بلکہ میری قبر کے اردگرد اتنی دیر ضرور کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کے گوشت کو بنا کر بانٹا جاتا ہے، اور اتنی دیر کھڑا رہنے کی غرض اور افادیت یہ بیان فرمائی کہ میں تم سے مانوس ہونگا، اور مجھے جوابات دینے میں آسانی رہے گی، (مشکوۃ) حدیث مبارک میں غرض قیام جن الفاظ میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہیں: "حتی استانس بکم واعلم ماذا اراجع بہ رسل ربی" میں تمہیں دیکھ کر یا تمہاری وجہ سے مانوس ہونگا اور مجھے معلوم ہوگا کہ میں نے فرشتوں کے سوالات کے کیا جواب دینا ہیں،، یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کا عمل جو سعد بن معاذ کی قبر پر کیا گیا تھا تلقین بر قبر اے فلاں کے بیٹے تو اس دین کو یاد کر جس دن میں تو تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور فعل کی موجودگی میں نئے انداز میں اپنے بیٹے کو وصیت کرنا کس چیز کو ثابت کرتا ہے؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول اور فعل ہی ضروی ہوتا تو یہ عمل درجہ استحباب میں تھا ہر جگہ، ہر میت کیلئے ان کی پابندی لازمی نہ تھی، مولف کتاچہ اذان بر قبر کو منع

کرتے ہوئے دیگر امور کی پابندی کا درس کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر عزیز واقارب کے محض کھڑا رہنے سے میت کو انس اور طمانیت نصیب ہے جوابات میں سہولت کا حصول ہورہا ہے تو کیا اذان دینے سے انس وطمانیت نصیب نہ ہوگی، کیا اللہ کے ذکر میں مخلوق کیلئے اتنی بھی تاثیر وبرکت نہیں؟ طمانیت تو اللہ کے ذکر سے ہی نصیب ہوتی ہے ارشاد خداوندی ہے: ''الابذکر اللہ تطمئن القلوب''

مولف کتابچہ نے راقم کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ قاضی صاحب کو انصاف کرنا چاہیے کیونکہ وہ عدل وانصاف کے منصب پر فائز ہیں مشاورت پر شکر گزار ہوں ساتھ یہ کہنا تقاضائے منصب خیال کرتا ہوں کہ راقم نے احادیث اذان، اقوال فقہاء اور نفی میں دیئے جانے والے دلائل کا بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد عدل اور انصاف کے ترازو پر اذان برقبر کو بدعت حسنہ کہا ہے؟

امام ابن حجر ایک بلند پایہ محدث ہیں، ان کے علم وفضل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے فرمان کی عقائد اہل سنت وجماعت کے آئینے میں توجیہ کی ہے، اس کو غلط تحریر نہیں کیا، ہم پہلے بھی یہ ذکر اور نقل کر چکے ہیں کہ علامہ ابن حجر نے مطلقاً بدعت کو بدعت ضلالۃ، بدعت سیءہ نہیں کہا، بلکہ اس کو کہا ہے جس کے معرض وجود میں لانے سے شرعی قباحت پیدا ہوتی ہو، پھر یہ کہ خود امام ابن حجر عسقلانی نے بدعت کو پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرمایا ہے اگر ان کی مراد مطلق بدعت سے بدعت ضلالۃ ہی ہوتو ان کے کلام اور عندیہ میں تعارض لازم آئیگا، ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ امام ابن حجر جیسا یکتائے روزگار فن حدیث کا عالم تضاد بیانی سے کام نہیں لے سکتا، لہٰذا ان قرائن لفظیہ کی موجودگی میں بدعت سے مراد امام موصوف کی بدعت سیءہ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے اور اس کی صحت پر حاشیہ بیجوری سے امام موصوف کا قول بھی بعد میں آرہا ہے، مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ اگر اذان برقبر کو اذان بعد از ولادت پر قیاس کیا گیا ہے تو بعد از دفن دوبارہ قبر کھولیں اور میت کے کان میں اذان دیں، سبحان اللہ کیا حکم ہے؟ یہ معارضہ ہے؟ اور کسقدر علمی رسائی ہے، علم تقاضا کرتا ہے

کرتے ہوئے دیگر امور کی پابندی کا درس کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر عزیز واقارب کے محض کھڑا رہنے سے میت کو انس اور طمانیت نصیب ہے جوابات میں سہولت کا حصول ہو رہا ہے تو کیا اذان دینے سے انس وطمانیت نصیب نہ ہوگی، کیا اللہ کے ذکر میں مخلوق کیلئے اتنی بھی تاثیر وبرکت نہیں؟ طمانیت تو اللہ کے ذکر سے ہی نصیب ہوتی ہے ارشاد خداوندی ہے: ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب''

مولف کتابچہ نے راقم کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ قاضی صاحب کو انصاف کرنا چاہیے کیونکہ وہ عدل وانصاف کے منصب پر فائز ہیں مشاورت پر شکر گزار ہوں ساتھ یہ کہنا تقاضائے منصب خیال کرتا ہوں کہ راقم نے احادیث اذان، اقوال فقہاء اور نفی میں دیئے جانے والے دلائل کا بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد عدل اور انصاف کے ترازو پر اذان بر قبر کو بدعت حسنہ کہا ہے؟

امام ابن حجر ایک بلند پایہ محدث ہیں، ان کے علم وفضل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے فرمان کی عقائد اہل سنت وجماعت کے آئینے میں توجیہ کی ہے، اس کو غلط تحریر نہیں کیا، ہم پہلے بھی یہ ذکر اور نقل کر چکے ہیں کہ علامہ ابن حجر نے مطلقاً بدعت کو بدعت ضلالۃ، بدعت سیۂ نہیں کہا، بلکہ اس کو کہا ہے جس کے معرض وجود میں لانے سے شرعی قباحت پیدا ہوتی ہو، پھر یہ کہ خود امام ابن حجر عسقلانی نے بدعت کو پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرمایا ہے اگر ان کی مراد مطلق بدعت سے بدعت ضلالۃ ہی ہو تو ان کے کلام اور عندیہ میں تعارض لازم آئیگا، ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ امام ابن حجر جیسا یکتائے روزگار فن حدیث کا عالم تضاد بیانی سے کام نہیں لے سکتا، لہٰذا ان قرائن لفظیہ کی موجودگی میں بدعت سے مراد امام موصوف کی بدعت سیۂ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے اور اس کی صحت پر حاشیہ بیجوری سے امام موصوف کا قول بھی بعد میں آرہا ہے، مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ اگر اذان بر قبر کو اذان بعد از ولادت پر قیاس کیا گیا ہے تو بعد از دفن دوبارہ قبر کھولیں اور میت کے کان میں اذان دیں، سبحان اللہ کیا حکم ہے؟ یہ معارضہ ہے؟ اور کسقدر علمی رسائی ہے، علم تقاضا کرتا ہے

کرتے ہوئے دیگر امور کی پابندی کا درس کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر عزیز واقارب کے محض کھڑا رہنے سے میت کو انس اور طمانیت نصیب ہے جوابات میں سہولت کا حصول ہو رہا ہے تو کیا اذان دینے سے انس وطمانیت نصیب نہ ہوگی، کیا اللہ کے ذکر میں مخلوق کیلئے اتنی بھی تاثیر وبرکت نہیں؟ طمانیت تو اللہ کے ذکر سے ہی نصیب ہوتی ہے ارشاد خداوندی ہے:''الابذکر اللہ تطمئن القلوب''

مولف کتابچہ نے راقم کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ قاضی صاحب کو انصاف کرنا چاہیے کیونکہ وہ عدل وانصاف کے منصب پر فائز ہیں مشاورت پر شکر گزار ہوں ساتھ یہ کہنا تقاضائے منصب خیال کرتا ہوں کہ راقم نے احادیث اذان، اقوال فقہاء اورنفی میں دیئے جانے والے دلائل کا بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد عدل اور انصاف کے ترازو پر اذان برقبر کو بدعت حسنہ کہا ہے؟

امام ابن حجر ایک بلند پایہ محدث ہیں، ان کے علم وفضل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے فرمان کی عقائد اہل سنت وجماعت کے آئینے میں توجیہ کی ہے، اس کو غلط تحریر نہیں کیا، ہم پہلے بھی یہ ذکر اور نقل کر چکے ہیں کہ علامہ ابن حجر نے مطلقاً بدعت کو بدعت ضلالۃ، بدعت سیءہ نہیں کہا، بلکہ اس کو کہا ہے جس کے معرض وجود میں لانے سے شرعی قباحت پیدا ہوتی ہو، پھر یہ کہ خود امام ابن حجر عسقلانی نے بدعت کو پانچ اقسام کی طرف تقسیم فرمایا ہے اگر ان کی مراد مطلق بدعت سے بدعت ضلالۃ ہی ہو تو ان کے کلام اور عندیہ میں تعارض لازم آئیگا، ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ امام ابن حجر جیسا یکتائے روزگار فن حدیث کا عالم تضاد بیانی سے کام نہیں لے سکتا، لہٰذا ان قرائن لفظیہ کی موجودگی میں بدعت سے مراد امام موصوف کی بدعت سیءہ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے اور اس کی صحت پر حاشیہ بیجوری سے امام موصوف کا قول بھی بعد مین آرہا ہے، مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ اگر اذان برقبر کو اذان بعد از ولادت پر قیاس کیا گیا ہے تو بعد از دفن دوبارہ قبر کھولیں اور میت کے کان میں اذان دیں، سبحان اللہ کیا حکم ہے؟ یا معارضہ ہے؟ اور کسقدر علمی رسائی ہے، علم تقاضا کرتا ہے

کہ ایسی لایعنی بات نہ کی جائے ، احادیث و آثار کے خلاف عقیدہ تراشی نہ کی جائے واضح رہے کہ قیاس کیلئے چار امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے (۱) مقیس (۲) مقیس علیہ (۳) علت (۴) حکم مقیس اور مقیس علیہ باہم ہم مثل نہیں ہوتے ، ان کے درمیان اشتراک علت کا رشتہ قائم ہوتا ہے، علت کے سہارے مقیس علیہ سے مقیس کی طرف حکم منتقل ہوتا ہے، مثلاً حالت حیض میں عورت سے جماع کرنا ممنوع ہے اسی طرح حالت حیض ہو یا نہ ہو عورت سے لواطت بھی ممنوع ہے، مقیس علیہ عورت کی اگلی شرمگاہ اور مقیس عورت کی دبر یعنی پچھلی شرمگاہ ہے، علت حکم مقام کا غلاظت اور نجاست سے آلودہ ہونا ہے اور حکم وطی اور لواطت کی ممانعت اور حرمت ہے، یعنی حالت حیض میں وطی کیوں ممنوع ہے، اس لیے کہ مقام وطی غلاظت آلودہ نجاست گاہ ہے، لواطت کیوں ممنوع ہے کہ دبر بھی نجاست اور غلاظت آلودہ ہے، لواطت کی ممانعت کو وطی کی ممانعت پر بوجہ غلاظت اور نجاست گاہ ہونے کے قیاس کیا گیا ہے، فرج اور دبر میں مغائرت ہے محل اور مآل کے اعتبار سے کوئی مماثلت نہیں، اس طرح اذان برقبر اور اذان بعد از ولادت کا حکم ایک ہی ہے، علت بھی ایک ہی ہے، اگر چہ مقامات کا فرق عیاں ہے، علت خیر و برکت ہے اور حکم جوازیت اور سنت کا ہونا ہے جب وجہ اذان ایک ہی ہے اور وہ حصول خیر و برکت ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مقام پر تو سنت ہو اور دوسرے مقام پر بدعت ضلالۃ ہو، مزید یہ کہ نومولود کے کان میں اذان دینا سنت ہے اور یہ طریقہ تواتر سے چلا آرہا ہے، یہ امر شرعی توقیفی ہے، اس پر عملدرآمد کرنا مورد شرع پر موقوف ہے،

قبر میں لیٹا ہوا شخص بچہ نہیں نومولود نہیں کہ اس کے کان میں اذان دی جائے ، قبر کھول کر میت کے کان میں اذان دینا امر شرعی توقیفی کی ممانعت ہے جو گمراہی اور بے دینی کے زمرہ میں آتی ہے ، ایک حکم بطریق تواتر ثابت ہے دوسرا حکم فقہی قیاسی ہے، ایک کا چھوڑنا ممنوع اور سنت متواترہ کے خلاف ہے دوسرے حکم کا چھوڑنا گناہ نہیں ، جب زمین اور آسمان اتنا فرق اذانُ نومولود

اور اذان برقبر کے درمیان ہے تو مولف کتابچہ نے کس دلیل پر تکیہ کرتے ہوئے قبر کھولنے
اور میت کے کان میں اذان دینے کو نومولود پر قیاس کیا ہے؟ مزید یہ کہ نومولود کے کان میں اذان
کی وجہ نومولود کا شعور، ادراک، علم اور قوت سماعت کی کمزوری ہے، میت کیلئے قبر میں یہ جملہ
خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اس لئے کان میں اذان کی کوئی ضرورت نہیں، قبر پر دی جانے
والی آواز تو دور، دور پھیلتی اور سنائی دیتی ہے، میت تو جوتوں کی آہٹ بھی سن رہی ہے، میت
دفنانے والوں کو دیکھتی اور پہچانتی ہے، قبر کھول کر اس کے کان مین اذان دینا چہ معنی دارد؟ کان
میں اذان دینے کیلئے نومولود کا ہونا اور ادراک وشعور سے عاری ہونا مشروط ہے، بچے کے کان
میں اذان دینے کا مقصد، خیر و برکت کا حصول ہے، میت کی قبر پر اذان دینے کا مقصد خیر و بخشش
کی استدعا اور ایک گونہ سفارش ہے،
اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم الاولین والاخرین ہیں، ''علمک
مالم تکن تعلم '' کے تحت ارضی اور سماوی علوم آپ کے دست نبوت میں ہیں، احوال دنیا ہوں
مناظر برزخ روز روشن کی طرح آپ پر عیاں اور آشکارا ہیں، قبر میں پیش آنے والے واقعات
آپ نے بیان فرمائے پوچھے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات آپ نے سکھائے، قبر
میں عذاب دینے والی چیزوں کی نشاندہی آپ نے فرمائی، میت کو فائدہ دینے والے امور کی
تفصیل آپ نے بتائی، منظر قبر اور احوال برزخ کا کوئی گوشہ آپ سے نہاں اور پنہاں نہیں، کبھی
قول ثابت کیلئے خود دعا فرمائی اور صحابہ کرام کو دعا پر مامور فرمایا، کبھی سبحان اللہ اور اللہ اکبر کی
کثرت سے میت کیلئے سامان راحت مہیا فرمایا اور کبھی یہ ارشاد فرمایا کہ میت سے کہو کہ اپنے اس
دن کو یاد کرو، دنیا میں جو تمہارا دین تھا، یہ تمام واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ میت کا حال قبر میں
ایک سا نہیں ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالات اور کیفیات کو ملاحظہ فرما کر مختلف عمل فرمائے
، اور صحابہ کرام کو تلقین کا حکم دیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فضائل اذان مین یہ بھی فرمایا ''الموذ

کہ ایسی لا یعنی بات نہ کی جائے ، احادیث و آثار کے خلاف عقیدہ تراشی نہ کی جائے واضح رہے کہ قیاس کیلئے چار امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے (۱) مقیس (۲) مقیس علیہ (۳) علت (۴) حکم مقیس اور مقیس علیہ باہم ہم مثل نہیں ہوتے ، ان کے درمیان اشتراک علت کا رشتہ قائم ہوتا ہے، علت کے سہارے مقیس علیہ سے مقیس کی طرف حکم منتقل ہوتا ہے، مثلاً حالت حیض میں عورت سے جماع کرنا ممنوع ہے اسی طرح حالت حیض ہو یا نہ ہو عورت سے لواطت بھی ممنوع ہے، مقیس علیہ عورت کی اگلی شرمگاہ اور مقیس عورت کی دبر یعنی پچھلی شرمگاہ ہے، علت حکم مقام کا غلاظت اور نجاست سے آلودہ ہونا ہے اور حکم وطی اور لواطت کی ممانعت اور حرمت ہے، یعنی حالت حیض میں وطی کیوں ممنوع ہے، اس لیے کہ مقام وطی غلاظت آلودہ نجاست گاہ ہے، لواطت کیوں ممنوع ہے کہ دبر بھی نجاست اور غلاظت آلودہ ہے، لواطت کی ممانعت کو وطی کی ممانعت پر بوجہ غلاظت اور نجاست گاہ ہونے کے قیاس کیا گیا ہے، فرج اور دبر میں مغائرت ہے محل اور مآل کے اعتبار سے کوئی مماثلت نہیں، اس طرح اذان بر قبر اور اذان بعد از ولادت کا حکم ایک ہی ہے، علت بھی ایک ہی ہے، اگر چہ مقامات کا فرق عیاں ہے، علت خیر و برکت ہے اور حکم جوازیت اور سنت کا ہونا ہے جب وجہ اذان ایک ہی ہے اور وہ حصول خیر و برکت ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مقام پر تو سنت ہو اور دوسرے مقام پر بدعت ضلالۃ ہو، مزید یہ کہ نومولود کے کان میں اذان دینا سنت ہے اور یہ طریقہ تواتر سے چلا آرہا ہے، یہ امر شرعی توقیفی ہے، اس پر عملدرآمد کرنا مورد شرع پر موقوف ہے،

قبر میں لیٹا ہوا شخص بچہ نہیں نومولود نہیں کہ اس کے کان میں اذان دی جائے ، قبر کھول کر میت کے کان میں اذان دینا امر شرعی توقیفی کی ممانعت ہے جو گمراہی اور بے دینی کے زمرہ میں آتی ہے ، ایک حکم بطریق تواتر ثابت ہے دوسرا حکم فقہی قیاسی ہے، ایک کا چھوڑنا ممنوع اور سنت متواترہ کے خلاف ہے دوسرے حکم کا چھوڑنا گناہ نہیں ، جب زمین اور آسمان اتنا فرق اذانِ نومولود

اوراذان برقبر کے درمیان ہے تو مولف کتابچہ نے کس دلیل پر تکیہ کرتے ہوئے قبر کھولنے اور میت کے کان میں اذان دینے کونومولود پر قیاس کیا ہے؟ مزید یہ کہ نومولود کے کان میں اذان کی وجہ نومولود کا شعور، ادراک، علم اور قوت سماعت کی کمزوری ہے، میت کیلئے قبر میں یہ جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اس لئے کان میں اذان کی کوئی ضرورت نہیں، قبر پردی جانے والی آواز تو دور، دور پھیلتی اور سنائی دیتی ہے، میت تو جوتوں کی آہٹ بھی سن رہی ہے، میت دفنانے والوں کودیکھتی اور پہچانتی ہے، قبر کھول کراس کے کان مین اذان دینا چہ معنی دارد؟ کان میں اذان دینے کیلئے نومولود کا ہونا اور ادراک وشعور سے عاری ہونا مشروط ہے، بچے کے کان میں اذان دینے کا مقصد، خیر وبرکت کا حصول ہے، میت کی قبر پراذان دینے کا مقصد خیر وبخشش کی استدعا اور ایک گونہ سفارش ہے،

اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم الاولین والاخرین ہیں، ''علمک مالم تکن تعلم'' کے تحت ارضی اور سماوی علوم آپ کے دست نبوت میں ہیں، احوال دنیا ہوں یا مناظر برزخ روز روشن کی طرح آپ پر عیاں اور آشکارا ہیں، قبر میں پیش آنے والے واقعات آپ نے بیان فرمائے پوچھے جانے والے سوالات اوران کے جوابات آپ نے سکھائے، قبر میں عذاب دینے والی چیزوں کی نشاندہی آپ نے فرمائی، میت کو فائدہ دینے والے امور کی تفصیل آپ نے بتائی، منظر قبر اور احوال برزخ کا کوئی گوشہ آپ سے نہاں اور پنہاں نہیں، کبھی قول ثابت کیلئے خود دعا فرمائی اور صحابہ کرام کو دعا پر مامور فرمایا، کبھی سبحان اللہ اور اللہ اکبر کی کثرت سے میت کیلئے سامان راحت مہیا فرمایا اور کبھی یہ ارشاد فرمایا کہ میت سے کہو کہ اپنے اس دن کو یاد کرو، دنیا میں جو تمہارا دین تھا، یہ تمام واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ میت کا حال قبر مین ایک سا نہیں ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالات اور کیفیات کو ملاحظہ فرما کر مختلف عمل فرمائے، اور صحابہ کرام کو تلقین کا حکم دیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فضائل اذان مین یہ بھی فرمایا ''الموذن

یغفر لہ مدی صوتہ'' کہ جہاں تک موذن کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک لوگ بخشش دیئے جاتے ہیں، ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں فرمایا:" وقیل معناہ یغفر بشفاعتہ ذنوب من کان ساکنا او مقیما الی حیث یبلغ صوتہ" (مرقات) اس کا معنی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ منتہائے آواز تک بسنے والے لوگوں کے گناہ اذان کی سفارش سے بخشش یئے جاتے ہیں،،

ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ:"لا یسمع صوت الموذن جن ولا انس ولا شیء الا شھد لہ یوم القیامۃ'' (مشکوۃ)

موذن کی آواز جو انسان، جن یا دوسری کوئی چیز سنتی ہے وہ قیامت کے دن موذن کیلئے گواہ ہوگی، اس پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا:''جن اور انس دونوں نکرہ ہیں اور لا نافیہ ان پر داخل ہے جو زندوں اور مردوں دونوں کے عموم کا فائدہ دے رہا ہے،،

مقصد یہ ہے کہ جن اور انسان زندہ ہوں یا مرے ہوئے، اذان کی آواز سنتے ہیں، اور کل قیامت کے دن موذن کے حق میں گواہی دیں گے، پہلی حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے موذن کی جہاں تک آواز پہنچتی ہے وہاں تک مومن موذن کی سفارش سے بخشش دیئے جاتے ہیں، ہر دو احادیث سے اذان کا زندوں اور مردوں دونوں کیلئے مفید ہونا ثابت ہوا، اور یہ افادیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ثابت ہے مولف کتابچہ کا یہ کہنا کہ میت کیلئے اذان مفید نہیں قطعی غلط اور خلاف سنت ہے، مولف کتابچہ کی سب سے قوی اور آفاقی دلیل یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اذان دی نہ دلوائی، لہٰذا ممنوع ہے، باعث عذاب ہے، بدعت ضلالۃ ہے ،توجہ فرمائیے مولف کتابچہ نے اذان بر قبر کی شرعی حیثیت کو نہیں سمجھا اگر اپنے اعتراض اور ہمارے موقف کے درمیان فقہی حیثیت کو سمجھ لیتے تو بے سمجھی میں یہ اعتراض نہ کرتے، ہمارا موقف ہے کہ اذان بر قبر امر حسن اور فعل مستحب ہے، سنت غیر موکدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کا فعل بدرجہ سنت موکدہ، متواترہ کے حکم میں ہے، اگر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذان دینے کا حکم فرماتے، صحابہ دیتے یا دینے کا حکم فرماتے تو وہ حکم بدرجہ سنت موکدہ بدرجہ وجوب کے ہوتا، آپ کا اور آپ کے صحابہ کرام کا اذان دینا اور نہ دینے کا حکم دینا ہی امر استحباب کو پیدا کرتا ہے، مولف کتابچہ کو کم از کم اتنا تو علم ہونا چاہیے کہ سنت اور مستحب کے درمیان فرق کیا ہے؟ امر حسن محتاج دلیل ہے یا محتاج اباحت؟ مستحب احکام شرع کی آخری شکل آخری حکم ہے، امر مباح کی ترقی یافتہ صورت ہے، جس کا وجود اور ثبوت اس کے حسن پر موقوف ہے، اصول فقہ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ حسن وقبح دونوں شرعی ہیں، عقلی نہیں مولف کتابچہ نے ان کے حسن وقبح کو اپنی عقل پر پرکھا اور بدعت ضلالۃ اور موجب سزا کہہ دیا کتابچہ، ص، ۳۰)

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اذان بر قبر کو بعد از ولادت اذان نومولود پر علماء نے قیاس کیا ہے علت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی طلب خیرات اور حسنات،،

علی قاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ: "اذا فرغ من دفن الرجل یقف علیہ ویقول استغفروا لاخیکم واسئلوا لہ التثبیت" (ابوداؤد، مرقات، ج، ۴، ص، ۸۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی جب میت کے دفنانے سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے ہوتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ اپنے بھائی کیلئے اللہ سے بخشش مانگو، اور اس کے لئے بوقت سوالات جوابات ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، حدیث پاک میں قبر پر کھڑا رہنے، بخشش مانگنے اور ثابت قدمی کیلئے دعا مانگنے کا ثبوت موجود ہے اور حدیث اذان میں بوسیلہ موذن سننے والوں کے لیے مغفرت ہوجانے کا ذکر ہے دونوں احادیث کا مال اور نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ میت کیلئے بخشش طلب کرنا اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرنا ہے، یہ دعائے استغفار ہاتھ اٹھا کر کی جائے، یا اذان کے کلمات طیبات پڑھ کر کی جائے؟ مقصد اور مآل ایک ہی ہے، قرآن پڑھنا باعث ثواب ہے ایک قرآن پڑھ کر ثواب حاصل کرتا ہے اور دوسرا خاموش، چپ رہ کر اور سن کر ثواب حاصل کرتا

يغفر له مدى صوته'' کہ جہاں تک موذن کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک لوگ بخشش دیئے جاتے ہیں، ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں فرمایا:'' وقيل معناه يغفر بشفاعته ذنوب من كان ساكنا او مقيما الى حيث يبلغ صوته'' (مرقات) اس کا معنی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ منتہائے آواز تک بسنے والے لوگوں کے گناہ اذان کی سفارش سے بخشش دیئے جاتے ہیں،،

ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ:'' لا يسمع صوت الموذن جن ولا انس ولا شيء الا شهد له يوم القيامة'' (مشکوۃ)

موذن کی آواز جو انسان، جن یا دوسری کوئی چیز سنتی ہے وہ قیامت کے دن موذن کیلئے گواہ ہوگی، اس پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا:'' جن اور انس دونوں نکرہ ہیں اور لا نافیہ ان پر داخل ہے جو زندوں اور مردوں دونوں کے عموم کا فائدہ دے رہا ہے،،

مقصد یہ ہے کہ جن اور انسان زندہ ہوں یا مرے ہوئے، اذان کی آواز سنتے ہیں، اور کل قیامت کے دن موذن کے حق میں گواہی دیں گے، پہلی حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے موذن کی جہاں تک آواز پہنچتی ہے وہاں تک مومن موذن کی سفارش سے بخشش دیئے جاتے ہیں، ہر دو احادیث سے اذان کا زندوں اور مردوں دونوں کیلئے مفید ہونا ثابت ہوا، اور یہ افادیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ثابت ہے مولف کتابچہ کا یہ کہنا کہ میت کیلئے اذان مفید نہیں قطعی غلط اور خلاف سنت ہے، مولف کتابچہ کی سب سے قوی اور آفاقی دلیل یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اذان دی نہ دلوائی، لہذا ممنوع ہے، باعث عذاب ہے، بدعت ضلالۃ ہے ،توجہ فرمائیے مولف کتابچہ نے اذان بر قبر کی شرعی حیثیت کو نہیں سمجھا اگر اپنے اعتراض اور ہمارے موقف کے درمیان فقہی حیثیت کو سمجھ لیتے تو بے سمجھی میں یہ اعتراض نہ کرتے، ہمارا موقف ہے کہ اذان بر قبر امر حسن اور فعل مستحب ہے، سنت غیر موکدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کا فعل بدرجہ سنت موکدہ، متواترہ کے حکم میں ہے، اگر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذان دینے کا حکم فرماتے ،صحابہ دیتے یا دینے کا حکم فرماتے تو وہ حکم بدرجہ سنت موکدہ اور بدرجہ وجوب کے ہوتا، آپ کا اور آپ کے صحابہ کرام کا اذان دینا اور نہ دینے کا حکم دینا ہی امر استحباب کو پیدا کرتا ہے، مولف کتابچہ کو کم از کم اتنا تو علم ہونا چاہیے کہ سنت اور مستحب کے درمیان فرق کیا ہے ؟امر حسن محتاج دلیل ہے یا محتاج اباحت ؟مستحب احکام شرع کی آخری شکل اور آخری حکم ہے ،امر مباح کی ترقی یافتہ صورت ہے ،جس کا وجود اور ثبوت اس کے حسن پر موقوف ہے ،اصول فقہ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ حسن وقبح دونوں شرعی ہیں، عقلی نہیں مولف کتابچہ نے اذان کے حسن وقبح کو اپنی عقل پر پرکھا اور بدعت ضلالۃ اور موجب سزا کہہ دیا ،(کتابچہ،ص،۳۰)

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اذان برقبر کو بعد از ولادت اذان نومولود پر علماء نے قیاس کیا ہے علت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی طلب خیرات اور حسنات،،

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:"اذا فرغ من دفن الرجل یقف علیہ ویقول استغفروا لاخیکم واسئلو الہ التثبیت" (ابوداود، مرقات، ج، ۴،ص،۸۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی جب میت کے دفنانے سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے رہتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ اپنے بھائی کیلئے اللہ سے بخشش مانگو ،اور اس کے لئے بوقت سوالات وجوابات ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، حدیث پاک میں قبر پر کھڑا رہنے، بخشش مانگنے اور ثابت قدمی کیلئے دعا مانگنے کا ثبوت موجود ہے اور حدیث اذان میں بوسیلہ موذن سننے والوں کے لیے مغفرت ہوجانے کا ذکر ہے دونوں احادیث کا مال اور نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ میت کیلئے بخشش طلب کرنا اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرنا ہے، یہ دعائے استغفار ہاتھ اٹھا کر کی جائے ، یا اذان کے کلمات طیبات پڑھ کر کی جائے ؟ مقصد اور مآل ایک ہی ہے، قرآن پڑھنا باعث ثواب ہے ،ایک قرآن پڑھ کر ثواب حاصل کرتا ہے اور دوسرا خاموش، چپ رہ کر اور سن کر ثواب حاصل کرتا

ہے، پڑھنے اور سننے والے دونوں کیلئے مفید ہے، اسی طرح اذان پڑھنے اور سننے والے دونوں کیلئے مفید ہے، برقبر امر حسن، امر مستحب ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ”حکمه الثواب علی الفعل و عدم اللوم علی الترک، (ردالمختار، ص، ۱۲۳)

امر مستحب کا حکم یہ ہے کیا جائے تو ثواب ملے گا اور اگر کوئی ترک کردے تو تارک کو ملامت نہیں کی جائے گی،

مولف کتابچہ نے ابن حجر کے قول کہ اذان برقبر بدعت ہے کو بہت اچھالا ہے، اور اس کا سہارا لے کر اذان برقبر کو موجب سزا قرار دیا، اور راقم کا مبلغ علم ناپا تولا، مولف کتابچہ کو علم ہونا چاہیے کہ علامہ ابن حجر کا فرمان ہمارے موقف کی نقیض نہیں، اس لئے کہ محدثین کے نزدیک سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل، تقریر، صحابہ کرام کے قول، فعل، اور تقریر کا نام ہے (نور الانوار)

یہ مسلم ہے کہ اذان برقبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے قول، فعل اور تقریر سے ثابت نہیں لیکن احادیث اذان میں فضائل اذان، فوائد اور ثمرات کا ذکر موجود ہے، امام ابن حجر کا بدعت کہنا اس کا معنی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر سے ثابت نہیں،

امام مذکور کے نزدیک بھی بدعت سے مراد بدعت حسنہ ہے، خود امام موصوف نے حاشیہ بیجوری، ج، ا، میں تحریر فرمایا ہے: ”ر دتة فی شرح العباب لکن ان وافق انز اله القبر خفف عنه فی السوال“ (العطایا الاحمدیہ، ج ا، ص، ۷۲)

میں نے شرح عباب میں اذان کے سنت ہونیکی تردید کی ہے لیکن اگر اذان اور میت کے قبر میں رکھنے کے درمیان موافقت ہو یعنی ان کا وقت ایک ہی ہو تو اس سے میت کو سوالات کا جواب دینے میں آسانی میسر ہو گی،،

اس سے واضح ہوا کہ علامہ ابن حجر اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ نہیں کہتے، ورنہ جوازیت اور

افادیت کی صراحت ہرگز نہ فرماتے، یہی توجیہ راقم نے اپنے رسالہ اذان برقبر کے، ص، ۵۲، پر کی ہے، مولف کتابچہ امام موصوف کے قول کو اچھال رہے تھے کہ اذان برقبر بدعت ضلالة موجب سزا ہے اب دیکھ لیں یہی امام موصوف حاشیہ بیجوری جلد اول ص، ۱۹۰، پر اذان کو مفید اور باعث سہولت فرمارہے ہیں، مولف کتابچہ کا غیر مفید کہنا اور موجب سزا کہنا خود امام موصوف کے موقف کے خلاف ہے، مولف کتابچہ نے سراج الفقہاء علامہ خیر الدین کے متعلق لکھا ایک شخص کے قیاس کی کیا حیثیت ہے؟ مولف کتابچہ کو اگر فقہ، اصول فقہ سے ذرہ بھر بھی تعلق ہوتا تو وہ شیخ الشیوخ علامہ رملی کے بارے میں حقارت آمیز یہ الفاظ زیب قرطاس نہ کرتے، علامہ ابن عابدین الشامی نے خیر الدین الرملی کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: ”من المتاخرين الفطام امام ابن الهمام وتلميذيه العلامة قاسم وابن امير حاج، والمصنف والرملی،

فقہاء متاخرین کی عظیم المرتبت شخصیات میں ان الہمام ان کا شاگرد قاسم اور ابن امیر حاج مصنف کتاب، اور علامہ خیر الدین الرملی ہیں،

مزید فرمایا: ”علامہ رملی تمام مفتیوں کے شیخ ھیں شیخ الفتیاء العلامة خیرا لدین الرملی،

”شیخی الخبر السامی والبحر الطامی واحد زمانه وحسنة اوانه شیخ الاسلام الشیخ خیر الدین الرملی“ صاحب درمختار نے فرمایا، کہ میرے شیخ بلند مرتبت عالم، پیکر علم یکتائے زمانہ، اپنے زمانے کے باعث حسنات، شیخ الاسلام، خیر الدین الرملی ہیں،

علامہ شامی نے شجرہ نسب کے ضمن میں فرمایا علامہ خیر الدین الرملی فاروقی النسل ہیں، ۹۹۳ ہجری میں تولد ہوئے اور ۱۰۸۱ ہجری میں رملہ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ،”الرملی الامام المفسر، المحدث الفقیه اللغوی الصوفی النحوی

افادیت کی صراحت ہرگز نہ فرماتے، یہی توجیہ راقم نے اپنے رسالہ اذان برقبر کے، ص، ۵۲، پر کی ہے، مولف کتابچہ امام موصوف کے قول کو اچھال رہے تھے کہ اذان برقبر بدعت ضلالۃ موجب سزا ہے اب دیکھ لیں یہی امام موصوف حاشیہ بیجوری جلد اول ص، ۱۹۰، پر اذان کو مفید اور باعث سہولت فرمارہے ہیں، مولف کتابچہ کا غیر مفید کہنا اور موجب سزا کہنا خود امام موصوف کے موقف کے خلاف ہے، مولف کتابچہ نے سراج الفقہاء علامہ خیر الدین کے متعلق لکھا ایک شخص کے قیاس کی کیا حیثیت ہے؟ مولف کتابچہ کو اگر فقہ، اصول فقہ سے ذرہ بھر بھی تعلق ہوتا تو وہ شیخ الشیوخ علامہ رملی کے بارے میں حقارت آمیز یہ الفاظ زیب قرطاس نہ کرتے، علامہ ابن عابدین الشامی نے خیر الدین الرملی کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''من المتاخرين الفطام امام ابن الهمام وتلميذيه العلامة قاسم وابن امير حاج، والمصنف والرملی،

فقہاء متاخرین کی عظیم المرتبت شخصیات میں ان الہمام ان کا شاگرد قاسم اور ابن امیر حاج مصنف کتاب، اور علامہ خیر الدین الرملی ہیں،

مزید فرمایا: ''علامہ رملی تمام مفتیوں کے شیخ ھیں شيخ الفتياء العلامة خيرا لدين الرملی،

''شيخی الخبر السامی والبحر الطامی واحد زمانه وحسنة اوانه شيخ الاسلام الشيخ خير الدين الرملی'' صاحب درمختار نے فرمایا، کہ میرے شیخ بلند مرتبت عالم، پیکر علم یکتائے زمانہ، اپنے زمانے کے باعث حسنات، شیخ الاسلام، خیر الدین الرملی ہیں،

علامہ شامی نے شجرہ نسب کے ضمن میں فرمایا علامہ خیر الدین الرملی فاروقی النسل ہیں، ۹۹۳ ہجری میں تولد ہوئے اور ۱۰۸۱ ہجری میں رملہ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ،'' الرملی الامام المفسر، المحدث الفقيه اللغوی الصوفی النحوی

افادیت کی صراحت ہرگز نہ فرماتے، یہی توجیہ راقم نے اپنے رسالہ اذان برقبر کے، ص، ۵۲، پر کی ہے، مولف کتابچہ امام موصوف کے قول کو اچھال رہے تھے کہ اذان برقبر بدعت ضلالة موجب سزا ہے اب دیکھ لیں یہی امام موصوف حاشیہ بیجوری جلد اول ص، ۱۹۰، پر اذان کو مفید اور باعث سہولت فرما رہے ہیں، مولف کتابچہ کا غیر مفید کہنا اور موجب سزا کہنا خود امام موصوف کے موقف کے خلاف ہے، مولف کتابچہ نے سراج الفقہاء علامہ خیر الدین کے متعلق لکھا ایک شخص کے قیاس کی کیا حیثیت ہے؟ مولف کتابچہ کو اگر فقہ، اصول فقہ سے ذرہ بھر بھی تعلق ہوتا تو وہ شیخ الشیوخ علامہ رملی کے بارے میں حقارت آمیز یہ الفاظ زیب قرطاس نہ کرتے، علامہ ابن عابدین الشامی نے خیر الدین الرملی کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: ”من المتاخرین الفطام امام ابن الهمام وتلمیذیه العلامة قاسم وابن امیر حاج، والمصنف والرملی،

فقہاء متاخرین کی عظیم المرتبت شخصیات میں ان الھمام ان کا شاگرد قاسم اور ابن امیر حاج مصنف کتاب، اور علامہ خیر الدین الرملی ہیں،

مزید فرمایا: ”علامہ رملی تمام مفتیوں کے شیخ ھیں شیخ الفتیاء العلامة خیرا لدین الرملی،

”شیخی الخبر السامی والبحر الطامی واحد زمانه وحسنة اوانه شیخ الاسلام الشیخ خیر الدین الرملی“ صاحب درمختار نے فرمایا، کہ میرے شیخ بلند مرتبت عالم، پیکر علم یکتائے زمانہ، اپنے زمانے کے باعث حسنات، شیخ الاسلام، خیر الدین الرملی ہیں،

علامہ شامی نے شجرہ نسب کے ضمن میں فرمایا علامہ خیر الدین الرملی فاروقی النسل ہیں، ۹۹۳ ہجری میں تولد ہوئے اور ۱۰۸۱ ہجری میں رملہ کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ”الرملی الامام المفسر، المحدث الفقیه اللغوی الصوفی النحوی

البیانی، العروضی المنطقی المعمر، شیخ الحنفیة فی عصرہ وصاحب الفتاوی السائرہ" علامہ خیرلدین الرملی امام وقت، مفسر، محدث فقیہ علم لغت کے ماہر، صوفی، علم نحو، علم بیان، علم عروض اور علم منطق کے ماہر، اپنے زمانے کے شیخ الاحناف، پوری دنیا میں پھیلے مشہور فتاوی کے مفتی،،

علامہ شامی اور علامہ حصکفی نے علامہ خیر الدین الرملی کے حضور جن الفاظ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ان سے علمی دنیا میں ان کی علو شان اور قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے مولف کتابچہ کیا جانیں علم و عمل میں خیر الدین الرملی کا کیا مقام ہے؟ علامہ مرحوم نے بلند پایہ فقہی شاہکار مرتب فرمائے،،

فقہ کی دقیق کتب پر حواشی اور ان کی شروحات تحریر فرمائیں، دسویں صدی ہجری سے آج تک امت مسلمہ ان سے استفادہ کررہی ہے ہر دور کے علماء نے ان کے پھیلائے ہوئے نور علم سے اکتساب فیض کیا، ان کی فقاہت کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اتنے جلیل القدر فقیہہ اور محدث کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے بن دیکھے حاشیہ بحر الرائق میں یہ لکھ دیا ہو کہ میں نے شافعی علماء کی کتب میں اذان بر قبر کو سنت لکھا ہوا دیکھا ہے، مزید علامہ شامی نے علامہ خیر الدین الرملی کی تائید کی ہے، جس سے علامہ خیر الدین الرملی کے موقف کی صداقت اور حقانیت کھل کر سامنے آگئی ہے مولف کتابچہ کی تحریر پر تف ہے جس میں اتنی عظیم علمی شخصیت کو ایک عام آدمی کی طرح ظاہر کیا گیا ہے اور پھر تحقیر شان میں یہ کہا کہ ایک آدمی کے قیاس کی کیا اہمیت ہے؟ مولف کتابچہ کا دعوی ہے کہ وہ علمی خاندان کے فرد ہیں، دعوی کی حد تک درست ہے، دعوی تو کوئی بھی کرسکتا ہے مگر حقائق اس کے منافی ہیں، کیونکہ اگر ان کو نور علم میسر ہوتا تو اس کی جھلک ضرور نظر آتی، واضح رہے کہ قیاس ایک ہی شخص کرتا ہے اس کیلئے اجتماع کی ضرورت نہیں ہوتی،، قیاس محتاج افراد نہیں بلکہ نور تدبر اور بصیرت تفکر کا مرہون منت ہے، علامہ خیر الدین الرملی بلاشبہ ان

نفوس قدسیہ میں سے ہیں، قیاس کرنے والے شخص کو مجتہد کہا جاتا ہے اور تفقہ فی الدین کے اعتبا
سے مجتہدین کے سات طبقات ہیں، آخری طبقہ اصحاب اہل ترجیح کا ہے یہ حضرات قرآن وسنت
اجماع امت، اقوال مجتہدین میں غور اور تدبر کے بعد حکم جاری کرتے ہیں کہ یہ معاملہ احکام
شرعیہ میں سے کس حکم کے تابع ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے مقدمہ شامی، مولف کتابچہ نے تحریر
ہے کہ اگر اذان بر قبر قیاس ہے تو پھر میت کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقام
کہیں، سبحان اللہ کیا علمی منطقی دلیل اور معارضہ اذان بر قبر اذان نومولود پر قیاس کیا گیا ہے
قیاس لغوی ہے، شرعی بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ اذان نومولود کی علت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتب
سنت اور حکم ہے،

مردہ شخص اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبا سے وہی نومولود ہے بعد از ولادت اتباع سنت
جس کے کان میں اذان کہی گئی تھی، اگر اس وقت اذان دینا سنت تھا تو بعد از مرگ اسی
اذان دینا سنت ہے کیونکہ محل اذان ایک ہی ہے اور غرض اذان بھی ایک ہی ہے، بعد از ولا
اذان کا مقصد طلب خیر اور برکت ہے اور بعد از مرگ اذان کا مقصد بھی طلب خیر اور بخشش
قیاس شرعی میں مقیس، مقیس علیہ، علت اور حکم ہوتے ہیں، مقیس علیہ اصل، مقیس فرع ہو
، اشتراک علت اور حکم مقیس اور مقیس علیہ میں مساوات اور مماثلت پیدا کرتے ہیں جی
اصول فقہ کا قانون ہے،

نومولود کے کان میں اذان اس لئے دی گئی کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے فطرت اسلام
آیا ہے، لہٰذا بتقاضائے اسلام اسی کے ایک اکان میں اذان اودوسرے میں اقامت کہ
شخص مسلمان ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی ہے، جب مسلمان ہو
ناطے اس کی ولادت کے بعد اس کے کان میں اذان دینا سنت تھا اب بعد از مرگ اس کی
اس کی منفعت دینی کیلئے اذان دینا ممنوع کیوں ہے؟

البيانی، العروضی المنطقی المعمر، شیخ الحنفیة فی عصره وصاحب الفتاوی السائرہ" علامہ خیرلدین الرملی امام وقت ، مفسر ، محدث فقیہ علم لغت کے ماہر، صوفی ، علم نحو، علم بیان ، علم عروض اور علم منطق کے ماہر، اپنے زمانے کے شیخ الاحناف ، پوری دنیا میں پھیلے مشہور فتاوی کے مفتی،،

علامہ شامی اور علامہ حصکفی نے علامہ خیر الدین الرملی کے حضور جن الفاظ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ان سے علمی دنیا میں ان کی علوشان اور قدر ومنزلت کا پتہ چلتا ہے مولف کتابچہ کیا جانیں علم وعمل میں خیر الدین الرملی کا کیا مقام ہے؟ علامہ مرحوم نے بلند پایہ فقہی شاہکار مرتب فرمائے،،

فقہ کی دقیق کتب پر حواشی اوران کی شروحات تحریر فرمائیں ، دسویں صدی ہجری سے آج تک امت مسلمہ ان سے استفادہ کررہی ہے ہر دور کے علماء نے ان کے پھیلائے ہوئے نور علم سے اکتساب فیض کیا، ان کی فقاہت کے سامنے سرتسلیم خم کیا، اتنے جلیل القدر فقیہہ اور محدث کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے بن دیکھے حاشیہ بحر الرائق میں یہ لکھ دیا ہو کہ میں نے شافعی علماء کی کتب میں اذان برقبر کوسنت لکھا ہوا دیکھا ہے، مزید علامہ شامی نے علامہ خیرالدین الرملی کی تائید کی ہے، جس سے علامہ خیر الدین الرملی کے موقف کی صداقت اور حقانیت کھل کر سامنے آگئی ہے مولف کتابچہ کی تحریر پر تف ہے جس میں اتنی عظیم علمی شخصیت کو ایک عام آدمی کی طرح ظاہر کیا گیا ہے اور پھر تحقیر شان میں یہ کہا کہ ایک آدمی کے قیاس کی کیا اہمیت ہے؟ مولف کتابچہ کا دعوی ہے کہ وہ علمی خاندان کے فرد ہیں، دعوی کی حد تک درست ہے، دعوی تو کوئی بھی کرسکتا ہے مگر حقائق اس کے منافی ہیں، کیونکہ اگر ان کو نور علم میسر ہوتا تو اس کی جھلک ضرور نظر آتی ، واضح رہے کہ قیاس ایک ہی شخص کرتا ہے اس کیلئے اجتماع کی ضرورت نہیں ہوتی،، قیاس محتاج افراد نہیں بلکہ نور تدبر اور بصیرت تفکر کا مرہون منت ہے، علامہ خیر الدین الرملی بلاشبہ ان

نفوس قدسیہ میں سے ہیں، قیاس کرنے والے شخص کو مجتہد کہا جاتا ہے اور تفقہ فی الدین کے اعتبار سے مجتہدین کے سات طبقات ہیں، آخری طبقہ اصحاب اہل ترجیح کا ہے یہ حضرات قرآن وسنت اجماع امت، اقوال مجتہدین میں غور اور تدبر کے بعد حکم جاری کرتے ہیں کہ یہ معاملہ احکامات شرعیہ میں سے کس حکم کے تابع ہے، تفصیل کیلئے دیکھئے مقدمہ شامی، مولف کتابچہ نے تحریر کیا ہے کہ اگر اذان برقبر قیاس ہے تو پھر میت کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہیں، سبحان اللہ کیا علمی منطقی دلیل اور معارضہ اذان برقبر اذان نومولود پر قیاس کیا گیا ہے، یہ قیاس لغوی ہے، شرعی بھی ہوسکتا ہے اس لئے کہ اذان نومولود کی علت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سنت اور حکم ہے،

مردہ شخص اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبا سے وہی نومولود ہے بعد از ولادت اتباع سنت میں جس کے کان میں اذان کہی گئی تھی، اگر اس وقت اذان دینا سنت تھا تو بعد از مرگ اسی کیلئے اذان دینا سنت ہے کیونکہ محل اذان ایک ہی ہے اور غرض اذان بھی ایک ہی ہے، بعد از ولادت اذان کا مقصد طلب خیر اور برکت ہے اور بعد از مرگ اذان کا مقصد بھی طلب خیر اور بخشش ہے،،

قیاس شرعی میں مقیس، مقیس علیہ، علت اور حکم ہوتے ہیں، مقیس علیہ اصل، مقیس فرع ہوتا ہے، اشتراک علت اور حکم مقیس اور مقیس علیہ میں مساوات اور مماثلت پیدا کرتے ہیں جیسا کہ اصول فقہ کا قانون ہے،

نومولود کے کان میں اذان اس لئے دی گئی کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے فطرت اسلام لے کر آیا ہے، لہٰذا بتقاضائے اسلام اسی کے ایک اکان میں اذان اودوسرے میں اقامت کہو، مردہ شخص مسلمان ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی ہے، جب مسلمان ہونے کے ناطے اس کی ولادت کے بعد اس کے کان میں اذان دینا سنت تھا اب بعد از مرگ اس کی قبر پر اس کی منفعت دینی کیلئے اذان دینا ممنوع کیوں ہے؟

میت کے کان میں اذان نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اقامت کہی جائے گی کیوں؟ نومولود کے کان میں اذان اس لئے دی گئی کہ اس کی قوت سماعت محدود اور حد درجہ کمزور ہے جبکہ میت سننے دیکھنے کی بھرپور صلاحیت اور قوت رکھتا ہے، س کے لئے پتھر اور سیمنٹ کے تختے، مٹی کا ڈھیر مانع نہیں، وہ قبر میں لیٹا ہوا، سارا بیرونی منظر دیکھ رہا ہے، مٹی ڈالنے اور دفنانے والوں کو پہچان رہا ہے، بلکہ جوتوں کی آہٹ سن رہا ہے، اس کے کان کی قوت سماعت میں کیا کمی ہے؟ کہ اس کے کان میں اذان دی جائے، پھر کان میں اذان دینا مطلق نہیں بلکہ مشروط ہے، شرط یہ ہے کہ نومولود ہو، یہ شخص نومولود نہیں لہذا اس کے کان میں اذان نہیں دی جائیگی،، اقامت بچے کے کان میں خیر و برکت کیلئے دی گئی، لیکن بعد از ولادت، سوائے نومولود کے کسی جگہ اقامت کا حکم نہیں کیونکہ اقامت قیام جماعت کی علامت اور اس کا خاصہ ہے، قیام جماعت کے علاوہ اس کا کوئی وجود اور ثبوت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بحالت غم و پریشانی کان میں اذان دلوانے کا حکم فرمایا تھا، اقامت کہلوانے کا ارشاد نہیں فرمایا تھا، جس سے ثابت ہوا کہ سوائے وقت قیام جماعت کے اقامت کا کوئی وجود نہیں، مولف کتابچہ کا اقامت کا حکم دینا دیوانے کی ایک بھڑک ہے، نومولود کے کان میں دی جانے والی اذان فقط نومولود کیلئے ہے اور اذان بر قبر کا فائدہ میت کے علاوہ دیگر سننے والوں کو بھی پہنچ رہا ہے، اس لئے بچے کے کان میں آہستہ اور قبر کا فائدہ میت کے علاوہ دیگر سننے والوں کو بھی پہنچ رہا ہے، اس لئے بچے کے کان میں آہستہ اور قبر پر باآواز بلند دی جاتی ہے،

مولف کتابچہ نے، ص، ۳۶، پر سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہو، یا آپ کے سامنے ہوا ہو اور آپ نے پسند کیا ہو، سنت ہے، واضح ہو کہ یہ تعریف غلط ہے، کس محدث یا فقیہہ نے یہ تعریف کی ہے نام نہیں لکھا، کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا، ملاحظہ ہو سنت کی تعریف، علامہ ملا جیون علیہ الرحمہ نے فرمایا: "السنة تطلق علی قول الرسول و فعله

وسکوته وعلی اقوال الصحابة وافعالهم "(نور الانوار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول فعل، سکوت یعنی تقریر صحابہ کے اقوال، افعالکو سنت کہا جاتا ہے،

مولف کتابچہ کے یہ الفاظ جو آپ کے سامنے ہوا ہو اور آپ نے پسند کیا ہو کہاں سے نقل کیے ہیں ؟ علامہ ابوالبرکات نسفی نے سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"هی الطریقه المسلوکة فی الدین پھر فرمایا: ان السنة تقع علی طریقة النبی وغیره یعنی الصحابة"

دین میں جو طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاری فرمائے ہیں ان کا نام سنت ہے،،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے بتائے ہوئے طریقوں کا نام سنت ہے، معلوم ہوا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریقہ کا نام ہے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال اقوال، تقریر، صحابہ کے افعال، اقوال اور تقریر کا نام ہے، مولف کتابچہ نے، ص ۱۱، پر سنت کا معنی اور تعریف لکھتے ہوئے کہا کہ سنت کے لغوی معنی راستہ اور طریقے کے ہوتے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں اس کے معنی ہیں وہ طریقہ اور راستہ جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی زندگی گزارنے کیلئے اختیار فرمایا، مولف نے یہ تعریف اصطلاحی بیان کی ہے جو غلط اور منافی فقہ ہے علامہ ابن عابدین الشامی نے سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ان کان مما واظب علیه الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم او الخلفاء الراشدون من بعد فسنة، والافمندوب ونفل" (ردالمختار، ص، ۱۰۲)

اور اگر اس امر کا چھوڑنا تو جائز ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے اس امر پر مداو، ت فرمائی ہو تو وہ سنت ہے اور اگر اس پر عمل دوام نہ فرمایا ہو تو وہ مستحب اور نفل ہے،

ہم نے حدیث فقہ، اصول فقہ جن کا موضوع ہی سنت ہے کی اصطلاحات پیش کی ہیں، جن میں سنت کی تعریفات بیان کی گئی ہیں، مولف کی نقل کردہ تعریف کسی فن کی اصطلاح میں نہ آتی ہے

میت کے کان میں اذان نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اقامت کہی جائے گی کیوں؟ نومولود کے کان میں اذان اس لئے دی گئی کہ اس کی قوت سماعت محدود اور حد درجہ کمزور ہے جبکہ میت سننے دیکھنے کی بھرپور صلاحیت اور قوت رکھتا ہے، اس کے لئے پتھر اور سیمنٹ کے تختے، مٹی کا ڈھیر مانع نہیں، وہ قبر میں لیٹا ہوا، سارا بیرونی منظر دیکھ رہا ہے، مٹی ڈالنے اور دفنانے والوں کو پہچان رہا ہے، بلکہ جوتوں کی آہٹ سن رہا ہے، اس کے کان کی قوت سماعت میں کیا کمی ہے؟ کہ اس کے کان میں اذان دی جائے، پھر کان میں اذان دینا مطلق نہیں بلکہ مشروط ہے، شرط یہ ہے کہ نومولود ہو، یہ شخص نومولود نہیں لہٰذا اس کے کان میں اذان نہیں دی جائیگی،، اقامت بچے کے کان میں خیر و برکت کیلئے دی گئی، لیکن بعد از ولادت، سوائے نومولود کے کسی جگہ اقامت کا حکم نہیں کیونکہ اقامت قیام جماعت کی علامت اور اس کا خاصہ ہے، قیام جماعت کے علاوہ اس کا کوئی وجود اور ثبوت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بحالت غم و پریشانی کان میں اذان دلوانے کا حکم فرمایا تھا، اقامت کہلوانے کا ارشاد نہیں فرمایا تھا، جس سے ثابت ہوا کہ سوائے وقت قیام جماعت کے اقامت کا کوئی وجود نہیں، مولف کتابچہ کا اقامت کا حکم دینا دیوانے کی ایک بھڑک ہے، نومولود کے کان میں دی جانے والی اذان فقط نومولود کیلئے ہے اور اذان برقبر کا فائدہ میت کے علاوہ دیگر سننے والوں کو بھی پہنچ رہا ہے، اس لئے بچے کے کان میں

آہستہ اور قبر کا فائدہ میت کے علاوہ دیگر سننے والوں کو بھی پہنچ رہا ہے، اس لئے بچے کے کان میں آہستہ اور قبر پر باآواز بلند دی جاتی ہے،

مولف کتابچہ نے، ص، ۳۶، پر سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہو، یا آپ کے سامنے ہوا ہو اور آپ نے پسند کیا ہو، سنت ہے، واضح ہو کہ یہ تعریف غلط ہے، کس محدث یا فقیہہ نے یہ تعریف کی ہے نام نہیں لکھا، کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا، ملاحظہ ہو سنت کی تعریف، علامہ ملا جیون علیہ الرحمہ نے فرمایا: ”السنة تطلق علی قول الرسول و فعله

وسکوته وعلی اقوال الصحابة وافعالهم "(نور الانوار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول فعل، سکوت یعنی تقریر صحابہ کے اقوال، افعالکو سنت کہا جاتا ہے،

مولف کتابچہ کے یہ الفاظ جو آپ کے سامنے ہوا ہو اور آپ نے پسند کیا ہو کہاں سے نقل کیے ہیں ؟ علامہ ابوالبرکات نسفی نے سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"ھی الطریقه المسلوکة فی الدین پھر فرمایا: ان السنة تقع علی طریقة النبی وغیرہ یعنی الصحابة"

دین میں جو طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاری فرمائے ہیں ان کا نام سنت ہے،، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے بتائے ہوئے طریقوں کا نام سنت ہے، معلوم ہوا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریقہ کا نام ہے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال اقوال، تقریر، صحابہ کے افعال، اقوال اور تقریر کا نام ہے، مولف کتابچہ نے، ص ۱۱، پر سنت کا معنی اور تعریف لکھتے ہوئے کہا کہ سنت کے لغوی معنی راستہ اور طریقے کے ہوتے ہیں ،اور اصطلاح شریعت میں اس کے معنی ہیں وہ طریقہ اور راستہ جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی زندگی گزارنے کیلئے اختیار فرمایا، مولف نے یہ تعریف اصطلاحی بیان کی ہے جو غلط اور منافی فقہ ہے علامہ ابن عابدین الشامی نے سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ان کان مما واظب علیه الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم او الخلفاء الراشدون من بعد فسنة ،والافمندوب ونفل" (ردالمختار، ص، ۱۰۲)

اور اگر اس امر کا چھوڑنا تو جائز ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے اس امر پر مداو، ت فرمائی ہو تو وہ سنت ہے اور اگر اس پر عمل دوام نہ فرمایا ہو تو وہ مستحب اور نفل ہے،

ہم نے حدیث فقہ، اصول فقہ جن کا موضوع ہی سنت ہے کی اصطلاحات پیش کی ہیں، جن میں سنت کی تعریفات بیان کی گئی ہیں، مولف کی نقل کردہ تعریف کسی فن کی اصطلاح میں نہ آتی ہے

جس سے اس تعریف کا خود ساختہ اور غیر منقول ہونا واضح ہے، جس شخص کو محدثین، فقہاء علمائے اصولین کی اصطلاحات اور بیان کردہ تعریف سنت تک رسائی نہیں وہ فقہ کے دقائق کو کیا جانے؟

مولف کتابچہ نے لکھا کہ آپ نے (راقم نے) مستحب عمل پر سنت کا اطلاق کیسے کیا؟ مستحب کو سنت کا درجہ کیسے دیا؟ آپ کی کون سی بات سچی ہے؟ یاد رہے کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فقہی دقائق اور استنباط کو جاننے کیلئے فقہی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، علامہ ابوالبرکات نسفی نے فرمایا سنت دو قسم ہے، (۱) سنۃ الھدی (۲) سنۃ الزوائد

قسم الاول کا تارک گنہگار اور مستحق عذاب ہوگا، جبکہ قسم ثانی کا تارک گنہگار نہیں مستحق عذاب بھی نہیں ہوگا، ملا جیون نے فرمایا کہ: "یثاب المرء علی فعله و لا یعاقب علی ترکھا و ھو فی معنی المستحب" سنت زائدہ کے کرنے پر ثواب اور ترک پر عذاب نہیں ملے گا سنت زائدہ مستحب کے حکم میں ہے، سنت زائدہ اور مستحب ہم معنی ہیں،،

ملا جیون نے نور الانوار میں فرمایا کہ: "فھذا کلھا من سنن الزوائد یثاب المرء علی فعلھا فلا یعاقب علی ترکھا و ھو فی معنی المستحب" سنت کی دوسری قسم سنن زوائد ہے اس کا تارک مستحق عذاب نہیں،،

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لباس مبارک، آپ کا بیٹھنا، اٹھنا یہ تمام چیزیں آپ سے عبادت اور قربت کی نیت سے صادر نہیں ہوئیں ان کا صدور عادت شریفہ پر ہے، یہ تمام امور سنن زوائد ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو ثواب ملے گا، چھوڑنے پر عذاب نہیں ہوگا، یہ مستحب کے درجہ میں ہے،،

عبارت مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ سنت کی دو قسمیں ہیں سنت ہدایت اور سنت زوائد۔

سنت زائدہ پر مستحب کا اطلاق کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنی مرضی اور عادات کے مطابق ادا فرمایا ہے، سنت زائد مستحب کا ہم معنی ہے، علماء اور فقہاء کے ہاں مستحب پر سنت کا اطلاق موجود اور معمول ہے، راقم الحروف نے اپنی کتاب کے ص، ۱۶ پر

مستحب کی تعریف نہیں کی بلکہ وجہ تسمیہ بتائی ہے، مولف کتابچہ کو غلط فہمی ہوئی ہے دوبارہ پڑھیں ،کاش کہ علمی خاندان کے فرد کو وجہ تسمیہ اور تعریف کے درمیان آج تک فرق معلوم نہیں ہوسکا، مولف کو علم نہیں کہ مستحب اور سنت زائد ہم معنی ہیں، مولف کتابچہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک شخص کا واقعہ نقل کیا کہ نماز عید سے قبل ایک شخص نماز نفل پڑھنا چاہتا تھا آپ نے منع فرمادیا، حالانکہ وہ نماز میں تعوذ ،ثناء، فاتحہ سورۃ پڑھتا، یہ سب امور جائز ہیں ،لہٰذا اذان بر قبر اگر چہ تکبیر، کلمہ شہادت پر مشتمل ہے مگر منع ہے بدعت ہے وغیرہ وغیرہ،،

مولف کتابچہ نے اس واقعہ کو دلیل ممانعت اور ایک معارضہ کی صورت میں پیش کیا ہے مگر ان کی یہ سعی لاحاصل اور بے مقصد ہے کیونکہ نماز عید سے قبل نفلی عبادت ممنوع ہے فقہ کے متون اور شروح میں اس امر کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ نماز عید سے قبل نفل پڑھنا ممنوع ہے،،

''ولا یتنفل فی المصلی قبل صلوۃ لعید'' نماز عید سے قبل عید گاہ میں نفل نہیں پڑھے جائیں گے،

حضرت علی کا فرمان درست ہے کیونکہ بخاری اور مسلم ابی سعید الخذری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب عید گاہ تشریف لے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ:

''اول شیء یبداء بہ الصلوۃ ثم ینصرف''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے نماز عید ادا فرماتے اور پھر تشریف لے جاتے،،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عید گاہ میں سب سے پہلے ادا کیا جانے والا عمل اور پہلے پڑھی جانے والی نماز عید ہی ہے، عبادت میں مومنین کو ''ماتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا'' کا پابند بنایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معمول اور حکم کے خلاف جو عبادت بھی کی جائیگی وہ عبادت نہیں بلکہ معصیت تصور ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں کوئی نیکی کا عمل موجب ثواب نہیں، مولف کتابچہ نے شرح مجمع البحرین سے یہ واقعہ نقل کیا ہے، اگر آخری الفاظ غور سے پڑھتے یا دیکھ لیتے تو اتنی زحمت اور ندامت گوارا کرنیکی نوبت نہ آتی وہ الفاظ یہ ہیں،

جس سے اس تعریف کا خود ساختہ اور غیر منقول ہونا واضح ہے، جس شخص کو محدثین، فقہاء علمائے اصولین کی اصطلاحات اور بیان کردہ تعریف سنت تک رسائی نہیں وہ فقہ کے دقائق کو کیا جانے؟

مولف کتابچہ نے لکھا کہ آپ نے (راقم نے) مستحب عمل پر سنت کا اطلاق کیسے کیا؟ مستحب کو سنت کا درجہ کیسے دیا؟ آپ کی کون سی بات سچی ہے؟ یاد رہے کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فقہی دقائق اور استنباط کو جاننے کیلئے فقہی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، علامہ ابوالبرکات نسفی نے فرمایا سنت دو قسم ہے، (۱) سنة الهدى (۲) سنة الزوائد

قسم الاول کا تارک گنہگار اور مستحق عذاب ہوگا، جبکہ قسم ثانی کا تارک گنہگار نہیں مستحق عذاب بھی نہیں ہوگا، ملا جیون نے فرمایا کہ: "يثاب المرء على فعله ولا يعاقب على تركها وهو في معنى المستحب" سنت زائدہ کے کرنے پر ثواب اور ترک پر عذاب نہیں ملے گا سنت زائدہ مستحب کے حکم میں ہے، سنت زائدہ اور مستحب ہم معنی ہیں،،

ملا جیون نے نورالانوار میں فرمایا کہ: "فهذا كلها من سنن الزوائد يثاب المرء على فعلها فلا يعاقب على تركها وهو في معنى المستحب" سنت کی دوسری قسم سنن زوائد ہے اس کا تارک مستحق عذاب نہیں،،

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لباس مبارک، آپ کا بیٹھنا، اٹھنا یہ تمام چیزیں آپ سے عبادت اور قربت کی نیت سے صادر نہیں ہوئیں ان کا صدور عادت شریفہ پر ہے، یہ تمام امور سنن زوائد ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو ثواب ملے گا، چھوڑنے پر عذاب نہیں ہوگا، یہ مستحب کے درجہ میں ہے،،

عبارت مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ سنت کی دو قسمیں ہیں سنت ہدایت اور سنت زوائد۔

سنت زائدہ پر مستحب کا اطلاق کیا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنی مرضی اور عادات کے مطابق ادا فرمایا ہے، سنت زائد مستحب کا ہم معنی ہے، علماء اور فقہاء کے ہاں مستحب پر سنت کا اطلاق موجود اور معمول ہے، راقم الحروف نے اپنی کتاب کے ص، ۱۶ پر

مستحب کی تعریف نہیں کی بلکہ وجہ تسمیہ بتائی ہے، مولف کتابچہ کو غلط فہمی ہوئی ہے دوبارہ پڑھیں ،کاش کہ علمی خاندان کے فرد کو وجہ تسمیہ اور تعریف کے درمیان آج تک فرق معلوم نہیں ہوسکا، مولف کو علم نہیں کہ مستحب اور سنت زائد ہم معنی ہیں، مولف کتابچہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک شخص کا واقعہ نقل کیا کہ نماز عید سے قبل ایک شخص نماز نفل پڑھنا چاہتا تھا آپ نے منع فرما دیا، حالانکہ وہ نماز میں تعوذ، ثناء، فاتحہ سورۃ پڑھتا، یہ سب امور جائز ہیں، لہٰذا اذان برقبر اگر چہ تکبیر، کلمہ شہادت پر مشتمل ہے مگر منع ہے بدعت ہے وغیرہ وغیرہ،،

مولف کتابچہ نے اس واقعہ کو دلیل ممانعت اور ایک معارضہ کی صورت میں پیش کیا ہے مگر ان کی یہ سعی لاحاصل اور بے مقصد ہے کیونکہ نماز عید سے قبل نفلی عبادت ممنوع ہے فقہ کے متون اور شروح میں اس امر کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ نماز عید سے قبل نفل پڑھنا ممنوع ہے،،

''ولا یتنفل فی المصلی قبل صلوۃ لعید'' نماز عید سے قبل عیدگاہ میں نفل نہیں پڑھے جائیں گے،

حضرت علی کا فرمان درست ہے کیونکہ بخاری اور مسلم ابی سعید الخذری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب عیدگاہ تشریف لے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ:

''اول شیء یبداء بہ الصلوۃ ثم ینصرف''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے نماز عید ادا فرماتے اور پھر تشریف لے جاتے،،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عیدگاہ میں سب سے پہلے ادا کیا جانے والا عمل اور پہلے پڑھی جانے والی نماز عید ہی ہے، عبادت میں مومنین کو ''ماتا کم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا'' کا پابند بنایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معمول اور حکم کے خلاف جو عبادت بھی کی جائیگی وہ عبادت نہیں بلکہ معصیت تصور ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں کوئی نیکی کا عمل موجب ثواب نہیں، مولف کتابچہ نے شرح مجمع البحرین سے یہ واقعہ نقل کیا ہے، اگر آخری الفاظ غور سے پڑھتے یا دیکھ لیتے تو اتنی زحمت اور ندامت گوارا کرنیکی نوبت نہ آتی وہ الفاظ یہ ہیں،

"لمخالفتک لرسولہ ﷺ" یعنی اس شخص کا نفل پڑھنا عبادت اور باعث ثواب کیوں نہ تھا اس لئے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت نمایاں تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیدگاہ میں نماز عید سے قبل کبھی نفلی عبادت نہ فرمائی تھی، جیسا کہ ابوسعید الخذری نے فرمایا: اول شی یبداء بہ الصلوۃ" لیکن اذان برقبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے میت کو دفنانے کے بعد کبھی آپ نے تسبیح اور تکبیر پڑھی ہے اور کبھی دعا کیلئے حکم فرمایا اور کسی جگہ میت کو نام سے پکار کر تلقین کا حکم فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص نے بھی بیٹے کو اپنی قبر پر کھڑا رہنے کی وصیت فرمائی، اگر قبر پر ذکر واذکر، دعا استغفار وغیرہ ممنوع ہوتے تو ان امور کی ادائیگی نہ کی جاتی اور نہ حکم دیا جاتا، بطور معارضہ اس واقعہ کو پیش کرنا غلط اور کج فہمی ہے،

بعد از دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مثبت عمل موجود ہے جو دلیل استحباب ہے، نماز عید سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل منفی ہے لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ قیاس مع الفارق ہے، ابوسعید الخذری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ: "کان رسول اللہ ﷺ لا یصلی قبل العید شیئا" (الحدیث، ابن اماجہ)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، لفظ شیاء اس پر دال ہے جو کہ نکرہ ہے، واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی طور پر مخالفت کر رہا تھا اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا، اذان برقبر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی منفی معمول موجود نہیں جس کی مخالفت میں اذان برقبر بدعت اور موجب عذاب ہو، تدبر و تفکر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ: "ان النبی ﷺ خرج فصلی بھم العید و لم یصل قبلھا و لا بعدھا" (فتح) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیدگاہ کی طرف گئے، صحابہ کو نماز عید پڑھائی اور نماز عید سے پہلے اور نماز عید کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی نماز نہیں پڑھی،، جب یہ محقق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز عید سے قبل کوئی نماز نہیں پڑھی تو اس شخص کا نماز

پڑھنا بوجہ مخالفت گناہ تصور ہوتا اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عید گاہ میں جو طریقہ مبارکہ تھا وہ بطور نص عید سے قبل ہر قسم کی نماز کی ممانعت کو ثابت کر رہا ہے، اور یہ ممانعت بطریق تواتر اور ثابت چلی آرہی ہے، فقہ کے متون اور شروح سے بھی یہی طرز عمل ثابت چلا آرہا ہے، اور یہ اجماع امت سے کم نہیں، لہٰذا عید گاہ میں نماز عید سے قبل نفل پڑھنا ممنوع ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منع کرنا بوجہ مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ، اذان برقبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی عمل منفی یا حکم نہی موجود نہیں بلکہ احادیث سے مثبت عمل بصورت استغفار دعائے ثبات، تسبیح تکبیر اور حکم تلقین موجود ہے، اس واقعہ کو مولف کتابچہ نے کس طرح اذان برقبر کی ممانعت اور مخالفت پر بطور دلیل پیش کیا ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں کوئی مسلمان حضرت علی پر فتوی کیسے لگا سکتا ہے، فتوی امر حق کے اظہار کیلئے بطور قول مفصل دیا جاتا ہے، حضرت علی کا اس شخص کے بارے میں طرز عمل قرآن وسنت کے عین مطابق تھا اس لئے ان کے عمل کے خلاف فتوی کی تعریض یا تحریک کا سوچنا بھی گناہ عظیم ہے، الحذر، الحذر''
یہاں اس بات کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر وہ کام جس سے نصاً یا اشارۃً بھی ممانعت یا مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت ہوتی ہو، اس کا کرنا گناہ ہے، اور ہر وہ کام جس کا ثبوت مطابقاً تضمناً یا التزاماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول یا عمل سے ہوتا ہو تو وہ ممنوع اور معصیت نہیں، بلکہ کار خیر ہے، اور ہر کار خیر باعث اجر وثواب ہے، مثلاً نماز اور اذان کے درمیان اقامت سے پہلے تثویب کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں صرف نماز فجر کیلئے تھا مگر علمائے متاخرین نے نماز مغرب کے علاوہ تین نمازوں کیلئے بھی تثویب کا اجراء فرمایا، تنویر الابصار در مختار میں ہے کہ
''یثوب بین الاذان والاقامة فی الکل بما تعارفوه، ای کل الصلوة لظهور التوانی فی الامور الدنینة'' علامہ ابن عابدین نے فی الکل پر فرمایا کہ تمام نمازوں کیلئے لوگوں کی پہچان جماعت کیلئے اذان اور اقامت کے درمیان تثویب کہی جائیگی،،

"لمخالفتک لرسولہ ﷺ" یعنی اس شخص کا نفل پڑھنا عبادت اور باعث ثواب کیوں نہ تھا اس لئے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت نمایاں تھی، رسول اللہ ﷺ نے عیدگاہ میں نماز عید سے قبل کبھی نفلی عبادت نہ فرمائی تھی، جیسا کہ ابوسعید الخذری نے فرمایا: اول شی یبداء بہ الصلوۃ" لیکن اذان بر قبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے میت کو دفنانے کے بعد کبھی آپ نے تسبیح اور تکبیر پڑھی ہے اور کبھی دعا کیلئے حکم فرمایا اور کسی جگہ میت کو نام سے پکار کر تلقین کا حکم فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص نے بھی بیٹے کو اپنی قبر پر کھڑا رہنے کی وصیت فرمائی، اگر قبر پر ذکر واذکر، دعا استغفار وغیرہ ممنوع ہوتے تو ان امور کی ادائیگی نہ کی جاتی اور نہ حکم دیا جاتا، بطور معارضہ اس واقعہ کو پیش کرنا غلط اور کج فہمی ہے،

بعد از دفن رسول اللہ ﷺ کا مثبت عمل موجود ہے جو دلیل استحباب ہے، نماز عید سے قبل رسول اللہ ﷺ کا عمل منفی ہے لہٰذا اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ قیاس مع الفارق ہے، ابوسعید الخذری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ: "کان رسول اللہ ﷺ لا یصلی قبل العید شیئا" (الحدیث، ابن اماجہ)

آپ ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، لفظ شیاء اس پر دال ہے جو کہ نکرہ ہے، واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی عملی طور پر مخالفت کر رہا تھا اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا، اذان بر قبر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی منفی معمول موجود نہیں جس کی مخالفت میں اذان بر قبر بدعت اور موجب عذاب ہو، تدبر و تفکر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ: "ان النبی ﷺ خرج فصلی بھم العید ولم یصل قبلھا ولا بعدھا" (فتح) نبی کریم ﷺ عیدگاہ کی طرف گئے، صحابہ کو نماز عید پڑھائی اور نماز عید سے پہلے اور نماز عید کے بعد آپ ﷺ نے کوئی نماز نہیں پڑھی، جب یہ محقق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عید سے قبل کوئی نماز نہیں پڑھی تو اس شخص کا نماز

پڑھنا بوجہ مخالفت گناہ تصور ہوتا اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عید گاہ میں جو طریقہ مبارکہ تھا وہ بطور نص عید سے قبل ہر قسم کی نماز کی ممانعت کو ثابت کر رہا ہے، اور یہ ممانعت بطریق تواتر اور ثابت چلی آرہی ہے، فقہ کے متون اور شروح سے بھی یہی طرز عمل ثابت چلا آرہا ہے، اور یہ اجماع امت سے کم نہیں، لہٰذا عید گاہ میں نماز عید سے قبل نفل پڑھنا ممنوع ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منع کرنا بوجہ مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ،اذان بر قبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی عمل منفی یا حکم نہی موجود نہیں بلکہ احادیث سے مثبت عمل بصورت استغفار دعائے ثبات، تسبیح تکبیر اور حکم تلقین موجود ہے، اس واقعہ کو مولف کتابچہ نے کس طرح اذان بر قبر کی ممانعت اور مخالفت پر بطور دلیل پیش کیا ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں کوئی مسلمان حضرت علی پر فتوی کیسے لگا سکتا ہے، فتوی امر حق کے اظہار کیلئے بطور قول مفصل دیا جاتا ہے، حضرت علی کا اس شخص کے بارے میں طرز عمل قرآن وسنت کے عین مطابق تھا اس لئے ان کے عمل کے خلاف فتوی کی تعریض یا تحریک کا سوچنا بھی گناہ عظیم ہے، الحذر، الحذر،،

یہاں اس بات کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر وہ کام جس سے نصاً یا اشارۃً بھی ممانعت یا مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت ہوتی ہو، اس کا کرنا گناہ ہے، اور ہر وہ کام جس کا ثبوت مطابقاً ،تضمناً یا التزاماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول یا عمل سے ہوتا ہو تو وہ ممنوع اور معصیت نہیں، بلکہ کار خیر ہے، اور ہر کار خیر باعث اجر وثواب ہے، مثلاً نماز اور اذان کے درمیان اقامت سے پہلے ثویب کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں صرف نماز فجر کیلئے تھا مگر علمائے متاخرین نے نماز مغرب کے علاوہ تین نمازوں کیلئے بھی ثویب کا اجراء فرمایا، تنویر الابصار در مختار میں ہے کہ

"یثوب بین الاذان والاقامة فی الکل بما تعارفوہ، ای کل الصلوۃ لظھور التوانی فی الامور الدنینة" علامہ ابن عابدین نے فی الکل پر فرمایا کہ تمام نمازوں کیلئے لوگوں کی پہچان جماعت کیلئے اذان اور اقامت کے درمیان ثویب کہی جائیگی،،

”قال فی العنایة احدث المتاخرون التثویب بین الا ذان الاقامة علی حسب ما تعارفوه فی جمیع الصلوت سوی المغرب مع ابقاء الاول یعنی الاصل وھو تثویب الفجر، ماراٰہ المسلمون حسنافھو عند اللہ حسن“ (شامی، ج۱،ص،۳۸۹)

تمام نمازوں کیلئے تثویب کہی جائیگی ،اس لئے کہ لوگ نمازوں کے معاملے میں سست ہو گئے ہیں، فتاوی عنایہ میں ہے کہ مغرب کے علاوہ باقی تمام نمازوں کیلئے اذان اور اقامت کے درمیان لوگوں کی پہچان کے مطابق تثویب کہنا علمائے متاخرین کی ایجاد ہے لیکن تثویب فجر الصلوۃ خیر من االنوم اپنی جگہ باقی رہے گی اور یہ احداث ،حدیث ماراہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن کے مطابق ہے یعنی بدعت ضلالۃ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے،،

فقہائے کرام کی مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ نماز فجر کے علاوہ باقی نمازوں کیلئے تثویب کا کہا جانا دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،دور صحابہ،دور تابعین، تبع تابعین، میں نہ تھا،مگران پاکیزہ ادوار کے بعد جب لوگوں کی دلچسپی دین معاملات سے ہٹ گئی دنیاوی معمولات میں زیادہ مصروف اور مشغول ہو گئے تو وقت جماعت کی طرف توجہ مبذول کرانے کیلئے فقہائے متاخرین نے طریقہ تثویب ایجاد کیا تا کہ لوگوں کو وقت قیام نماز اور جماعت کا علم ہو سکے، یہ تثویب بلاشبہ بدعت ہے مگر بدعت سیۂ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے، اس تثویب کے ذریعے لوگوں کو شمولیت نماز اور شرکت جماعت کی دعوت دی گئی ہے اور یہ امر چونکہ کار خیر ہے تعاونوا علی البر والتقوی،، کی ایک کڑی ہے لہٰذا موجب ثواب ہے، معصیت نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کہ جس امر کو علمائے امت حسن خیال کریں اور متفق ہو جائیں وہ اللہ کے ہاں بھی کار حسن ہے، کے مطابق مقصد یہ کہ یہ تثویب حدیث مبارکہ کی ہی تعبیر وتشریح ہے یہاں دونوں باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے زمانے میں تمام نمازوں کیلئے تثویب نہ کہی گئی اور نہ حکم دیا گیا، صرف فجر کیلئے الصلوۃ خیر من النوم متعارف تھا، علمائے امت نے لوگوں کو دیکھا

ہ وہ دینی امور سے دور اور دنیاوی امور میں مشغول اور مصروف ہو گئے ہیں، تو ان کی اصلاح اور
بت کیلئے تمام نمازوں کیلئے طریقہ تثویب کو جاری فرمایا صاحب ہدایہ نے فرمایا،،
و هذا التثويب احدثه علماء الكوفة بعد عهد الصحابة رضى الله عنهم، لتغير احوال
اس ، وخصوا الفجريه ، المتاخريون استحسنوه فى الصلوة كلها لظهور التوانى
ى الامور"
ائے کوفہ نے نماز فجر کیلئے خصوصی طور پر تثویب کو جاری فرمایا، دور صحابہ کرام علیہم الرضوان کے
عد اس کو جاری کیا گیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے دینی اور مذہبی حالات تبدیل ہو گئے
تھے، علمائے متاخرین نے بقیہ نمازوں کیلئے بھی مستحسن قرار دیا ہے اس لئے کہ لوگ دینی
معاملات میں سست اور کاہل ہو گئے ہیں،
تمام نمازوں کیلئے تثویب کہنا عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عہد صحابہ کرام میں نہ تھا، علمائے
متاخرین نے لوگوں کے بدلتے ہوئے دینی حالات ملاحظہ فرمائے تو احوال کی اصلاح کے پیش
نظر اس طریقہ کو امر حسن قرار دیا، یہ بدعت حسنہ ہے،
مولف کتابچہ کے مطابق اس طریق تثویب کو بدعت ضلالۃ ہونا چاہیے، کیونکہ بقول مولف ہر
بدعت ضلالۃ ہے، مگر علمائے متاخرین نے اس طریقہ تثویب کو امر حسن یعنی بدعت حسنہ ارشاد
فرمایا ہے، اس بدعت حسنہ کی اصل سند، اور ثبوت وہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال کو اذان فجر میں الصلوۃ خیر من النوم زیادہ کرنے کا حکم فرمایا تھا، اس
طرح اذان برقبر، دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ اور تابعین میں نہ تھی، مگر لوگ عملی طور پر دین سے بے
بہرہ اور دنیاوی مشاغل میں منہمک ہو گئے تھے، علمائے متاخرین نے میت کی بخشش، رعایت
اور طمانیت کیلئے اذان برقبر کو جاری فرمایا، پانچ نمازوں کیلئے جس طرح تثویب دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں نہ تھی، مگر علماء نے ''ماوراہ المسلمون حسنا

"قال فی العنایة احدث المتاخرون التثویب بین الا ذان الاقامة علی حسب ما تعارفوه فی جمیع الصلوت سوی المغرب مع ابقاء الاول یعنی الاصل وھو تثویب الفجر، ماراہ المسلمون حسنافھو عنداللہ حسن" (شامی، ج۱،ص،۳۸۹)

تمام نمازوں کیلئے تثویب کہی جائیگی، اس لئے کہ لوگ نمازوں کے معاملے میں سست ہوگئے ہیں، فتاوی عنایہ میں ہے کہ مغرب کے علاوہ باقی تمام نمازوں کیلئے اذان اوراقامت کے درمیان لوگوں کی پہچان کے مطابق تثویب کہنا علمائے متاخرین کی ایجاد ہے لیکن تثویب فجر الصلوۃ خیر من االنوم اپنی جگہ باقی رہے گی اور یہ احداث، حدیث ماراہ المسلمون حسنافھو عنداللہ حسن کے مطابق ہے یعنی بدعت ضلالۃ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے،،

فقہائے کرام کی مذکورہ بالاعبارات سے معلوم ہوا کہ نماز فجر کے علاوہ باقی نمازوں کیلئے تثویب کا کہا جانا دورنبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دورصحابہ، دورتابعین، تبع تابعین، میں نہ تھا، مگران پاکیزہ ادوار کے بعد جب لوگوں کی دلچسپی دین معاملات سے ہٹ گئی دنیاوی معمولات میں زیادہ مصروف اور مشغول ہوگئے تووقت جماعت کی طرف توجہ مبذول کرانے کیلئے فقہائے متاخرین نے طریقہ تثویب ایجاد کیا تاکہ لوگوں کووقت قیام نماز اور جماعت کا علم ہوسکے، یہ تثویب بلاشبہ بدعت ہے مگر بدعت سیۂ نہیں بلکہ بدعت حسنہ ہے، اس تثویب کے ذریعے لوگوں کوشمولیت نماز اورشرکت جماعت کی دعوت دی گئی ہے اور یہ امر چونکہ کارخیر ہے تعاونوا علی البروالتقوی،، کی ایک کڑی ہے لہٰذا موجب ثواب ہے، معصیت نہیں، اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کہ جس امر کوعلمائے امت حسن خیال کریں اور متفق ہوجائیں وہ اللہ کے ہاں بھی کارحسن ہے، کے مطابق مقصد یہ کہ یہ تثویب حدیث مبارکہ کی ہی تعبیروتشریح ہے یہاں دونوں باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے زمانے میں تمام نمازوں کیلئے تثویب نہ کہی گئی اور نہ حکم دیا گیا، صرف فجر کیلئے الصلوۃ خیر من النوم متعارف تھا، علمائے امت نے لوگوں کو دیکھا

کہ وہ دینی امور سے دور اور دنیاوی امور میں مشغول اور مصروف ہو گئے ہیں، تو ان کی اصلاح اور رغبت کیلئے تمام نمازوں کیلئے طریقہ تثویب کو جاری فرمایا صاحب ہدایہ نے فرمایا،،

”وھذا التثویب احدثہ علماء الکوفۃ بعد عھد الصحابۃ رضی اللہ عنھم، لتغیر احوال الناس، وخصوا الفجریہ، المتاخریون استحسنوہ فی الصلوۃ کلھا لظھور التوانی فی الامور“

علمائے کوفہ نے نماز فجر کیلئے خصوصی طور پر تثویب کو جاری فرمایا، دور صحابہ کرام علیہم الرضوان کے بعد اس کو جاری کیا گیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے دینی اور مذہبی حالات تبدیل ہو گئے تھے، علمائے متاخرین نے بقیہ نمازوں کیلئے بھی مستحسن قرار دیا ہے اس لئے کہ لوگ دینی معاملات میں سست اور کاہل ہو گئے ہیں،

تمام نمازوں کیلئے تثویب کہنا عہد رسوالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عہد صحابہ کرام میں نہ تھا، علمائے متاخرین نے لوگوں کے بدلتے ہوئے دینی حالات ملاحظہ فرمائے تو احوال کی اصلاح کے پیش نظر اس طریقہ کو امر حسن قرار دیا، یہ بدعت حسنہ ہے،

مولف کتابچہ کے مطابق اس طریق تثویب کو بدعت ضلالۃ ہونا چاہیے، کیونکہ بقول مولف ہر بدعت ضلالۃ ہے، مگر علمائے متاخرین نے اس طریقہ تثویب کو امر حسن یعنی بدعت حسنہ ارشاد فرمایا ہے، اس بدعت حسنہ کی اصل سند، اور ثبوت وہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال کو اذان فجر میں الصلوۃ خیر من النوم زیادہ کرنے کا حکم فرمایا تھا، اس طرح اذان بر قبر، دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ اور تابعین میں نہ تھی، مگر لوگ عملی طور پر دین سے بے بہرہ اور دنیاوی مشاغل میں منہمک ہو گئے تھے، علمائے متاخرین نے میت کی بخشش، رعایت اور طمانیت کیلئے اذان بر قبر کو جاری فرمایا، پانچ نمازوں کیلئے جس طرح تثویب دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں نہ تھی، مگر علماء نے ”ماوراہ المسلمون حسنا

فھو عند اللہ حسن کے تحت داخل ہے، مولف کتابچہ کا اذان کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط اور فقہ سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اذان برقبر کی سند اور اصل اذان نومولود، اور اذان علی رضی اللہ عنہ ہے ، جو بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان میں دی گئی ہے، اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اذان برقبر کا وجود نہیں اور یہ اس لحاظ سے بدعت ضلالۃ ہے تو مولف کتابچہ بتائیں صرف ،نحو، اصول فقہ، معانی، بیان، اصول حدیث، اصول، تفسیر، علم العروض، علم القوافی، وغیرہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں تھے؟ ہرگز نہیں صدیوں سے مدارس میں انکی تعلیم اور تدریس کا سلسلہ جاری اور ساری ہے، یہ ساری کاروائی بدعت ہے، کیا یہ بدعت حسنہ ہے ؟ یا سیۂ،، اگر سیۂ ہے تو صدیوں پر محیط اس سلسلہ تعلیم کو بدعت ضلالۃ تسلیم کرنا ہوگا اور ان ادوار کے علماء طلباء کو معاذ اللہ گمراہ کہنا پڑیگا اگر مولف کتابچہ کے علمی خاندان نے ان علوم وفنون کو سیکھا ہے تو وہ بھی اسی صف میں کھڑے ہوں گے ،فیصلہ ناظرین، قارئین کے ہاتھ میں ہے کہ کیا صدیوں پر محیط یہ عرصہ گمراہی کا ہے؟ لہٰذا مولف کتابچہ کا سوچ ، سمجھے بغیر علمائے امت کی تدریسی ، تدوینی ، خدمات کو گمراہی کہنا خود گمراہی ہے ،علمائے امت گمراہ نہیں ہو سکتے ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضمانت دے رکھی ہے کہ میری امت کے علماء امر ضلالۃ پر ہرگز متحد اور متفق نہیں ہوں گے ،فروعات میں اختلاف باعث رحمت ہے،،

حدیث کی روشنی میں کسی امر کو حسن ، یا بدعت ضلالۃ قرار دینا علمائے راسخین کا کام ہے، یہ اس شخص کا کام نہیں جو لفظ فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی تک نہ جانتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے :

"من سن فی الاسلام سنة حسنة" الحدیث کا منصب عوام الناس کو عطا نہیں فرمایا، بلکہ ان علمائے امت کو ارزاں فرمایا گیا ہے، جن کو" من یرد اللہ بہ خیرا یفقھه فی الدین " کی سند حاصل ہے جہال نے بدعت، حسن اور ضلالۃ کا مفہوم اپنی جاہلانہ سوچ کے تابع کر رکھا ہے مگر یہ امور شرعی، علمی اور تحقیقی ہیں، ان کے مفہوم مدعا اور مآل کے معلوم کرنے کیلئے اجتہادی بصیرت کی

ضرورت ہے جومن جانب اللہ عطا ہوتی ہے، کسی علمی خاندان کا فرد ہونا اس کیلئے کافی اور حتمی نہیں،، خطیب کے روبرو اذان خطبہ دینا پھر لاؤڈ سپیکر پر دینا، پانچ نمازوں کیلئے لاؤڈ سپیکر پر اذان دین محراب و منبر پر زیب و زینت کرنا، مساجد پر شیشہ کاری کرنا، چراغ کی جگہ بجلی کے قمقمے اور ٹیوب لائیٹس جلانا، قالین کی صفیں وغیرہ کا وجود دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور دور تابعین اور تبع تابعین میں نہ تھا مگر اس وقت ہر مسجد کیلئے یہ اجزائے حیات تسلیم کیے گئے ہیں، ان امور کی موجودگی میں نماز ادا کی جاتی ہے اگر بقول مولف کتابچہ کل بدعۃ ضلال اپنے عموم پر رہی ہے تو پھر امام، خطیب، موذن اور نمازی سب کے سب گمراہی میں ملوث قرا پائے، خود مولف کتابچہ بھی اس کی لپیٹ میں آگئے، کیونکہ وہ بھی مبلغ یورپ بتائے گئے ہیں، جبکہ فقہاء نے فرمایا کہ خطیب کے روبرو اذان خطبہ بدعت حسنہ ہے،،

ملاحظہ ہو فتاوی شامی کہ: "وکذالک نقول فی الاذان بین یدی الخطیب بدعۃ حسنۃ ماراہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن"

اس طرح ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خطیب کے روبرو اذان خطبہ دینا بھی بدعت حسنہ ہے کیونکہ رسو اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کام اور جس امر جدید کو علماء امت حسن کہیں وہ اللہ کے ہاں حسن ہی ہے،،

اگر اذان بر قبر دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین تبع تابعین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمع) کے دور میں ہوتی تو بدرجہ سنت موکدہ ہوتی، لیکن کوئی شخص بھی اذان بر قبر کے سنت موکدہ ہو کا قائل نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ بدعت حسنہ ہے بدعت سیئہ نہیں یاد رہے، کہ مس شرعیہ دو قسم کے ہیں (۱) اصولیات معتقدات کا نام ہے معتقدات سماعی توقیفی ہیں، ان کا اور اختلاف کفر ہے، فروعات یہ مجتہدات ہیں، اصولیات میں اجتہاد اور انکار کی کوئی گنجائش ، اجتہادات میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے، اور یہ باعث رحمت ہے،

فھو عند اللہ حسن کے تحت داخل ہے، مولف کتابچہ کا اذان کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط اور فقہ سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اذان بر قبر کی سند اور اصل اذان نومولود، اور اذان علی رضی اللہ عنہ ہے ، جو بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان میں دی گئی ہے، اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اذان بر قبر کا وجود نہیں اور یہ اس لحاظ سے بدعت ضلالۃ ہے تو مولف کتابچہ بتائیں صرف ،نحو، اصول فقہ، معانی، بیان، اصول حدیث، اصول، تفسیر، علم العروض، علم القوافی، وغیرہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں تھے؟ ہرگز نہیں صدیوں سے مدارس میں انکی تعلیم اور تدریس کا سلسلہ جاری اور ساری ہے، یہ ساری کاروائی بدعت ہے، کیا یہ بدعت حسنہ ہے ؟ یا سیءہ، اگر سیءہ ہے تو صدیوں پر محیط اس سلسلہ تعلیم کو بدعت ضلالۃ تسلیم کرنا ہوگا اور ان ادوار کے علماء طلباء کو معاذ اللہ گمراہ کہنا پڑیگا اگر مولف کتابچہ کے علمی خاندان نے ان علوم وفنون کو سیکھا ہے تو وہ بھی اسی صف میں کھڑے ہوں گے ،فیصلہ ناظرین، قارئین کے ہاتھ میں ہے کہ کیا صدیوں پر محیط یہ عرصہ گمراہی کا ہے؟ لہٰذا مولف کتابچہ کا سوچ ، سمجھے بغیر علمائے امت کی تدریسی ،تدوینی ، خدمات کو گمراہی کہنا خود گمراہی ہے ،علمائے امت گمراہ نہیں ہو سکتے ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضمانت دے رکھی ہے کہ میری امت کے علماء امر ضلالۃ پر ہرگز متحد اور متفق نہیں ہوں گے، فروعات میں اختلاف باعث رحمت ہے،،

حدیث کی روشنی میں کسی امر کو حسن ، یا بدعت ضلالۃ قرار دینا علمائے راسخین کا کام ہے، یہ اس شخص کا کام نہیں جو لفظ فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی تک نہ جانتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے :

"من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ" الحدیث کا منصب عوام الناس کو عطا نہیں فرمایا، بلکہ ان علمائے امت کو ارزاں فرمایا گیا ہے، جن کو "من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین" کی سند حاصل ہے جہال نے بدعت، حسن اور ضلالۃ کا مفہوم اپنی جاہلانہ سوچ کے تابع کر رکھا ہے مگر یہ امور شرعی، علمی اور تحقیقی ہیں، ان کے مفہوم مدعا اور مآل کے معلوم کرنے کیلئے اجتہادی بصیرت کی

ضرورت ہے جومن جانب اللہ عطا ہوتی ہے، کسی علمی خاندان کا فرد ہونا اس کیلئے کافی اور حتمی نہیں،، خطیب کے روبرو اذان خطبہ دینا پھر لاؤڈ سپیکر پر دینا، پانچ نمازوں کیلئے لاؤڈ سپیکر پر اذان دینا محراب ومنبر پر زیب وزینت کرنا، مساجد پر شیشہ کاری کرنا، چراغ کی جگہ بجلی کے قمقمے اور ٹیوب لائیٹس جلانا، قالین کی صفیں وغیرہ کا وجود دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور دور تابعین اور تبع تابعین میں نہ تھا مگر اس وقت ہر مسجد کیلئے یہ اجزائے حیات تسلیم کیے گئے ہیں، ان امور کی موجودگی میں نماز ادا کی جاتی ہے اگر بقول مولف کتابچہ کل بدعة ضلالة اپنے عموم پر ہی ہے تو پھر امام، خطیب، موذن اور نمازی سب کے سب گمراہی میں ملوث قرار پائے، خود مولف کتابچہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے، کیونکہ وہ بھی مبلغ یورپ بتائے گئے ہیں، جبکہ فقہاء نے فرمایا کہ خطیب کے روبرو اذان خطبہ بدعت حسنہ ہے،،

ملاحظہ ہو فتاوی شامی کہ: "وکذالک نقول فی الاذان بین یدی الخطیب بدعة حسنة اذ ماراٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن"

اس طرح ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خطیب کے روبرو اذان خطبہ دینا بھی بدعت حسنہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کام اور جس امر جدید کو علماء امت حسن کہیں وہ اللہ کے ہاں بھی حسن ہی ہے،،

اگر اذان برقبر دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین تبع تابعین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے دور میں ہوتی تو بدرجہ سنت موکدہ ہوتی، لیکن کوئی شخص بھی اذان برقبر کے سنت موکدہ ہونے کا قائل نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ بدعت حسنہ ہے بدعت سیئہ نہیں یاد رہے، کہ مسائل شرعیہ دو قسم کے ہیں (۱) اصولیات معتقدات کا نام ہے معتقدات سماعی توقیفی ہیں، ان کا انکار اور اختلاف کفر ہے، فروعات یہ مجتہدات ہیں، اصولیات میں اجتہاد اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں ، اجتہادات میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے، اور یہ باعث رحمت ہے،

اس لئے کہ اس میں حصول حق اور تحقیق حق کی خاطر جستجو اور کاوش کی گئی ہے، یہ ہمت اور بخشش باعث رحمت ہے، اسی آزادی رائے اور جواز اختلاف پر آئمہ مجتہدین اپنی خداداد اجتہادی بصیرت کو کام میں لائے اور الگ الگ فقہ مدون ہوئی، اس اختلاف رائے اور فروعی تحقیق کی حوصلہ افزائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا فروعی مسائل میں علمائے امت کا اختلاف سراپا رحمت ہے، فروعی اختلاف میں کسی بھی محقق رائے کار پر گمراہ یا گمراہی کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اختلاف کو گمراہی کہا جائیگا، کیونکہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر مہر رحمت چسپاں فرمادی ہے جن فقہاء نے اذان برقبر کو سنت کہا انہوں نے بعد از تحقیق سنت کہا ہے اور جن علماء نے سنت ہونیکی نفی فرمائی ہے ان کا مدعا یہ ہے کہ یہ سنت متوارثہ متواترہ نہیں، لیکن اذان برقبر کی افادیت پر اتفاق ہے، امام ابن حجر نے بھی آخر کار اس کی افادیت کو تسلیم کیا جیسا کہ حاشیہ بیجوری جلد اول کے حوالے سے پہلے نقل ہو چکا ہے، خلاصہ کلام یہ ہے جو امور بدعت حسنہ کی صف میں آتے ہیں وہ بدعت ضلالۃ نہیں، جیسا کہ اذان برقبر خطیب کے روبرو اذان خطبہ، لاؤڈ سپیکر کا استعمال مساجد کی آرائش وغیرہ، لہٰذا ہر امر جدید کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط ہے،،

مقام غور ہے ہر روز لاؤڈ سپیکر پر پانچ مرتبہ اذان دیکر ہر موذن ہر مسجد میں بدعت کا ارتکاب کرتا ہے، اذان برقبر کو بدعت کہنے والے سنتے اور دیکھتے ہیں مگر معترض نہیں ہوتے اذان خطبہ ہر جامع مسجد میں خطیب کے روبرو دی جاتی ہے، مولف کتابچہ بھی اس ماحول ار کیفیت میں تبلیغ فرماتے ہونگے اگر کل بدعۃ ضلالۃ ہی درست ہے تو وہ پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں اور سوچیں کہ کس منہ سے وہ ہمیں بدعتی کہہ رہے ہیں، جبکہ وہ بھی بدعتی ہیں، ایسے وقت پر یاد کیوں نہیں رہتا کہ یہ امور دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے زمانے میں نہ تھے، اذان ثانی کا شرعی حکم کیا ہے، دلیل پیش کیجیے لاؤڈ سپیکر تو موثر اور دور تک ایک آلہ دعوت حق ہے، مگر اذان ثانی کا شرعی حکم کیا ہے واجب کا درجہ رکھتی ہے، لیکن واجب بدعت کے ذریعہ ادا کیا جارہا ہے، یہاں

رگ ایمانی کیوں نہیں پھڑکتی؟ مولف کتابچہ اور ان کے ہم نواؤں کے مسلمہ مقتداء اور حکیم الامت مولانا اشرفعلی تھانوی نے ایک مسئلہ بہشتی زیور میں تحریر فرمایا ہے کہ نماعیدین کے بعد دعا مانگنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اوران کے صحابہ، تابعن، تبع تابعین سے مروی نہیں مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دعامانگنا مسنون ہے اس لئے بعد نماز عیدین بھی دعا مانگنا مسنون ہوا (بہشتی زیور، ص،۱۱، ص،۸۱)

حکیم الامت نے نماز عیدین کے بعد دعامانگنے کو سنت کہا ہے حالانکہ اس دعا کا ثبوت دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، دور صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نہ تھا، معلوم ہوا بدعت ہے جیسا کہ مولف کتابچہ اوران کے ہم مسلک اذان برقبر کو بدعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا وجود قرون اولیٰ میں نہ تھا اگر عیدین کے بعد دعامانگنافی الواقع یہ بدعت ہے تو سنت کیسے ہوگئی؟ گمراہی کیوں نہ ہوئی، اگر مولانا تھانوی بدعت کو سنت کہہ دیں تو دیوبندی مکتب فکر کے لوگ آنکھیں بند کر کے تسلیم کرلیں اوران کے حکم اور فتوی کو صحیفہ اسمانی کی طرح سینے سے لگالیں مگر سنی العقیدہ علماء امر مسنون کو سنت کہہ دیں تو ان پر بدعت کا فتوی یہ کہاں کی ایمانداری اور کہاں کا انصاف ہے، بدعت ہر جگہ ہر حال میں بدعت ہی ہے، اور بقول مولف ضلالۃ ہے، ضلالۃ پر سنت کا اطلاق کیسے درست ہے؟ جو نیا کام دوررسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، دور صحابہ، دور تابعین اور تبع تابعین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) میں عمل کا حصہ نہیں بنا، مگر حکیم الامت کے علم میں سنت ہے، تو سوال یہ ہے کہ حکیم الامت نے بدعت کو سنت کس دلیل کی بنیاد پر کہا ہے؟ مولف کتابچہ بتائیں کیا حکیم الامت کو احکام شرعیہ میں ردوبدل کرنے کا اختیار حاصل ہے؟ اگر وہ قیاس کی بنیاد پر بدعت کو سنت کا درجہ دینے کے اہل ہیں تو کیا فقہاء متاخرین امر جدید کو اشتراک علت اور حکم کی بنیاد پر سنت نہیں کہہ سکتے؟ فقہی اصول وضوابط میں تو حکیم الامت انہی کے خوشہ چیں ہیں، ہر بدعت کی گردن پر ضلالۃ کا چھرار کھنے والوں کو حکیم الامت کا یہ فرمان اور فتوی نظر نہیں آیا؟ معلوم ہوتا ہے

اس لئے کہ اس میں حصول حق اور تحقیق حق کی خاطر جستجو اور کاوش کی گئی ہے، یہ ہمت اور بخشش باعث رحمت ہے، اسی آزادی رائے اور جواز اختلاف پر آئمہ مجتہدین اپنی خداداد اجتہادی بصیرت کو کام میں لائے اور الگ الگ فقہ مدون ہوئی، اس اختلاف رائے اور فروعی تحقیق کی حوصلہ افزائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا فروعی مسائل میں علمائے امت کا اختلاف سراپا رحمت ہے، فروعی اختلاف میں کسی بھی محقق رائے کار پر گمراہ یا گمراہی کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اختلاف کو گمراہی کہا جائیگا، کیونکہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر مہر رحمت چسپاں فرمادی ہے جن فقہاء نے اذان برقبر کو سنت کہا انہوں نے بعد از تحقیق سنت کہا ہے اور جن علماء نے سنت ہونیکی نفی فرمائی ہے ان کا مدعا یہ ہے کہ یہ سنت متوارثہ متواترہ نہیں، لیکن اذان برقبر کی افادیت پر اتفاق ہے، امام ابن حجر نے بھی آخر کار اس کی افادیت کو تسلیم کیا جیسا کہ حاشیہ بیجوری جلد اول کے حوالے سے پہلے نقل ہو چکا ہے، خلاصہ کلام یہ ہے جو امور بدعت حسنہ کی صف میں آتے ہیں وہ بدعت ضلالۃ نہیں، جیسا کہ اذان برقبر خطیب کے روبرو اذان خطبہ، لاؤڈ سپیکر کا استعمال مساجد کی آرائش وغیرہ، لہٰذا ہر امر جدید کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط ہے،،

مقام غور ہے ہر روز لاؤڈ سپیکر پر پانچ مرتبہ اذان دیکر ہر موذن ہر مسجد میں بدعت کا ارتکاب کرتا ہے، اذان برقبر کو بدعت کہنے والے سنتے اور دیکھتے ہیں مگر معترض نہیں ہوتے اذان خطبہ ہر جامع مسجد میں خطیب کے روبرو دی جاتی ہے، مولف کتابچہ بھی اس ماحول ار کیفیت میں تبلیغ فرماتے ہونگے اگر کل بدعۃ ضلالۃ ہی درست ہے تو وہ پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں اور سوچیں کہ کس منہ سے وہ ہمیں بدعتی کہہ رہے ہیں، جبکہ وہ بھی بدعتی ہیں، ایسے وقت پر یاد کیوں نہیں رہتا کہ یہ امور دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے زمانے میں نہ تھے، اذان ثانی کا شرعی حکم کیا ہے، دلیل پیش کیجیے لاؤڈ سپیکر تو موثر اور دور تک ایک آلہ دعوت حق ہے، مگر اذان ثانی کا شرعی حکم کیا ہے واجب کا درجہ رکھتی ہے، لیکن واجب بدعت کے ذریعہ ادا کیا جارہا ہے، یہاں

رگ ایمانی کیوں نہیں پھڑکتی؟ مولف کتابچہ اور ان کے ہم نواؤں کے مسلمہ مقتداء اور حکیم الامت مولانا اشرفعلی تھانوی نے ایک مسئلہ بہشتی زیور میں تحریر فرمایا ہے کہ نماعیدین کے بعد دعا مانگنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے صحابہ، تابعن، تبع تابعین سے مروی نہیں مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دعامانگنا مسنون ہے اس لئے بعد نماز عیدین بھی دعا مانگنا مسنون ہوا (بہشتی زیور، ص،۱۱، ص،۸۱)

حکیم الامت نے نماز عیدین کے بعد دعامانگنے کو سنت کہا ہے حالانکہ اس دعا کا ثبوت دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، دور صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نہ تھا، معلوم ہوا بدعت ہے جیسا کہ مولف کتابچہ اوران کے ہم مسلک اذان برقبر کو بدعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا وجود قرون اولیٰ میں نہ تھا اگر عیدین کے بعد دعامانگنافی الواقع یہ بدعت ہے تو سنت کیسے ہوگئی؟ گمراہی کیوں نہ ہوئی، اگر مولانا تھانوی بدعت کو سنت کہہ دیں تو دیوبندی مکتب فکر کے لوگ آنکھیں بند کر کے تسلیم کرلیں اوران کے حکم اورفتوی کوصحیفہ اسمانی کی طرح سینے سے لگالیں مگرسنی العقیدہ علماء امر مسنون کوسنت کہہ دیں تو ان پر بدعت کا فتوی یہ کہاں کی ایمانداری اور کہاں کا انصاف ہے ، بدعت ہر جگہ ہر حال میں بدعت ہی ہے، اور بقول مولف ضلالۃ ہے، ضلالۃ پر سنت کا اطلاق کیسے درست ہے؟ جو نیا کام دوررسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، دور صحابہ، دور تابعین اور تبع تابعین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) میں عمل کا حصہ نہیں بنا، مگر حکیم الامت کے علم میں سنت ہے، تو سوال یہ ہے کہ حکیم الامت نے بدعت کو سنت کس دلیل کی بنیاد پر کہا ہے؟ مولف کتابچہ بتائیں کیا حکیم الامت کو احکام شرعیہ میں ردوبدل کرنے کا اختیار حاصل ہے؟ اگروہ قیاس کی بنیاد پر بدعت کو سنت کا درجہ دینے کے اہل ہیں تو کیا فقہاء متاخرین امر جدید کو اشتراک علت اور حکم کی بنیاد پر سنت نہیں کہہ سکتے؟ فقہی اصول وضوابط میں تو حکیم الامت انہی کے خوشہ چیں ہیں، ہر بدعت کی گردن پر ضلالۃ کا چھرار کھنے والوں کو حکیم الامت کا یہ فرمان اور فتوی نظر نہیں آیا؟ معلوم ہوتا ہے

مولف کتابچہ جومقیم برطانیہ ہی میں پونڈوں کا ڈھیر رکھتے ہیں وہاں ذہنی اور فکری آزادی ہے محض خیالات سے استفادہ کر کے پمفلٹ چھپوایا اور انگلی خون آلود کر کے شہداء میں اپنا نام درج کروانے کی کوشش کی ہے، بتائیے یہ کل بدعة ضلالة کی چھاپ نہیں؟

دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، دور صحابہ، دور تابعین، تبع تابعین میں اذان نہ پانے والوں کو عیدین کے بعد دعا بدعت ہونا نظر آئی ہے؟ یا نہیں آئی اگر آئی ہے تو مولانا تھانوی کے متعلق آپ کا ضمیر اوور انصاف کیا کہتا ہے؟ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کا دور تو وجود اذان بر قبر سے خالی ہے کیوں؟

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسمہ رحمت ہیں اور عالمین کیلئے ہیں دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انوار وحی،، انوار قرآن، اور انوار توحید ورسالت کا غلبہ تھا، قرآن پاک نازل ہورہا تھا، رشد وہدایت کی اہم ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر تھی، تعلیم وتربیت کے پروگرام ترجیح بنیادوں پر مرتب کیے گئے تھے، بادشاہوں، شہنشاہوں کی طرف تبلیغ دعوت کیلئے وفود کی روانگی جیسے اہم امور پر کام ہورہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری توجہ تعلیم قرآن پر مرکوز تھی، مباحات اور مستحبات کی طرف خیال فرمانے کی ضرورت نہ تھی، رہبری کیلئے نزول وحی کا سلسلہ موجود تھا، دیگر کسی طرف توجہ فرمانے کی ضرورت نہ تھی، پھر یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ جب کوئی بندہ مومن انتقال کر جاتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ممکن اس کے جنازہ، کفن، دفن میں شریک ہوتے، اور خود اس کی نماز جنازہ پڑھاتے،، حضرت یزید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ”مامات منکم میت ما کنت بین اظھر کم الا اذنتمونی بہ فان صلاتی علیہ رحمة“ دوسری حدیث میں ہے: لا یموتن احد منکم الا اذنتمونی بہ فان صلوتی علیہ رحمة“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مرجائے اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں تو تم مجھے اس کی موت کی ضرور اطلاع دو گے، میں اس کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا، کیونکہ میرا اس

کی نماز جنازہ پڑھانا سراپائے رحمت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ! جب بھی تم میں سے کوئی شخص مرجائے مجھے اس کی اطلاع ضرور دو، کیونکہ میرا اس کی نماز جنازہ پڑھانا اس کیلئے رحمت ہی رحمت ہے، ان احادیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومن کی نماز جنازہ پڑھانے کیلئے بے تاب رہا کرتے تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پابند کردیا تھا، کہ جب کوئی شخص فوت ہوجائے تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دینا اس تحریص کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمائی کہ میں اس کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا تو اللہ تعالی اس کو اپنی رحمت کاملہ میں ڈھانپ لیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نماز جنازہ پڑھانا میت کیلئے رحمت کاملہ ہے اور رحمت کاملہ ہر قسم کے گناہوں کو مٹادیتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالی میت کو رحمت سے نوازتا ہے اور میت کیلئے باران رحمت کا نزول امر یقینی ہے اس لئے کہ یہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، جس مین شائبہ وہم وگمان نہیں، اذان بر قبر طلب رحمت اور بخشش کیلئے ایک حیلہ سازی ہے جس کے نتیجہ میں نزول رحمت اور میت کی بخشش یقینی طور پر نہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی اور نماز جنازہ پڑھنے پر بلاشک وشبہ رحمت ہوگئی، تو اذان بر قبر جو ایک حیلہ طلب رحمت ہے اس کو دینے کی کیا ضرورت تھی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میت کیلئے رحمت کا حصول امر یقینی اور اذان بر قبر سے رحمت کا حصول اور وجود امر ظنی ہے، امر یقینی کے ہوتے ہوئے امر ظنی کی طرف توجہ دینے کا کیا مقصد تھا؟ آپ نے اپنے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کو خیرات برکات اور حسنات کا زمانہ ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں: "خیر امتی قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم" (متفق علیہ)

میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے،

مولف کتابچہ جو مقیم برطانیہ ہی میں پونڈوں کا ڈھیر رکھتے ہیں وہاں ذہنی اور فکری آزادی ہے محض خیالات سے استفادہ کر کے پمفلٹ چھپوایا اور انگلی خون آلود کر کے شہداء میں اپنا نام درج کروانے کی کوشش کی ہے، بتائیے یہ کل بدعۃ ضلالۃ کی چھاپ نہیں؟

دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دور صحابہ، دور تابعین، تبع تابعین میں اذان نہ پانے والوں کو عیدین کے بعد دعا بدعت ہونا نظر آئی ہے؟ یا نہیں آئی اگر آئی ہے تو مولانا تھانوی کے متعلق آپ کا ضمیر اوور انصاف کیا کہتا ہے؟ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کا دور تو وجود اذان بر قبر سے خالی ہے کیوں؟

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسمہ رحمت ہیں اور عالمین کیلئے ہیں دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انوار وحی،، انوار قرآن، اور انوار توحید ورسالت کا غلبہ تھا، قرآن پاک نازل ہورہا تھا، رشد وہدایت کی اہم ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر تھی، تعلیم وتربیت کے پروگرام ترجیح بنیادوں پر مرتب کیے گئے تھے، بادشاہوں، شہنشاہوں کی طرف تبلیغ دعوت کیلئے وفود کی روانگی جیسے اہم امور پر کام ہورہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری توجہ تعلیم قرآن پر مرکوز تھی، مباحات اور مستحبات کی طرف خیال فرمانے کی ضرورت نہ تھی، رہبری کیلئے نزول وحی کا سلسلہ موجود تھا، دیگر کسی طرف توجہ فرمانے کی ضرورت نہ تھی، پھر یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ جب کوئی بندہ مومن انتقال کرجاتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ممکن اس کے جنازہ، کفن، دفن میں شریک ہوتے، اور خود اس کی نماز جنازہ پڑھاتے،، حضرت یزید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "مامات منکم میت ما کنت بین اظہر کم الا اذنتمونی بہ فان صلاتی علیہ رحمۃ" دوسری حدیث میں ہے: لا یموتن احد منکم الا اذنتمونی بہ فان صلوتی علیہ رحمۃ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مرجائے اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں تو تم مجھے اس کی موت کی ضرور اطلاع دو گے، میں اس کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا، کیونکہ میرا اس

کی نماز جنازہ پڑھانا سراپائے رحمت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ! جب بھی تم میں سے کوئی شخص مرجائے مجھے اس کی اطلاع ضرور دو، کیونکہ میرا اس کی نماز جنازہ پڑھانا اس کیلئے رحمت ہی رحمت ہے، ان احادیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومن کی نماز جنازہ پڑھانے کیلئے بے تاب رہا کرتے تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پابند کردیا تھا، کہ جب کوئی شخص فوت ہوجائے تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دینا اس تحریص کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمائی کہ میں اس کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت کاملہ میں ڈھانپ لیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نماز جنازہ پڑھانا میت کیلئے رحمت کاملہ ہے اور رحمت کاملہ ہر قسم کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالیٰ میت کو رحمت سے نوازتا ہے اور میت کیلئے باران رحمت کا نزول امر یقینی ہے اس لئے کہ یہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، جس مین شائبہ وہم وگمان نہیں، اذان برقبر طلب رحمت اور بخشش کیلئے ایک حیلہ سازی ہے جس کے نتیجہ میں نزول رحمت اور میت کی بخشش یقینی طور پر نہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی اور نماز جنازہ پڑھنے پر بلاشک وشبہ رحمت ہوگئی، تو اذان برقبر جو ایک حیلہ طلب رحمت ہے اس کو دینے کی کیا ضرورت تھی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میت کیلئے رحمت کا حصول امر یقینی اور اذان برقبر سے رحمت کا حصول اور وجود امر ظنی ہے، امر یقینی کے ہوتے ہوئے امر ظنی کی طرف توجہ دینے کا کیا مقصد تھا؟ آپ نے اپنے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کو خیرات برکات اور حسنات کا زمانہ ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں: "خیر امتی قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم" (متفق علیہ)

میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے،

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین کو خیر امت فرمایا ہے، جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یہ حضرات انوار قرآن، اور انوار رسالت سے روشن اور منور ہیں، بدعملی فساد عقیدہ کا تصور تک موجود نہیں، ان ادوار کے شب وروز اطاعت خداوندی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شعاعوں سے تابناک ہیں،، ان ادوار میں علم معرفت، عبادت، ریاضت، سیرت اور کردار کے اجالے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، ہر مومن اپنے سر پر خیر امتی کا تاج سجائے منزل قرب ورضا کی طرف رواں دواں ہے وہ ادوار جن کے متعلق لوگوں نے زبان رسالت سے خیر امتی کی بشارت سن رکھی ہے ان کی بخشش اور ان لوگوں کیلئے طلب رحمت یا مغفرت کی استدعا کرنے کی کیا حاجت ہے؟

صحابہ اور تابعین کا دور تشریحات کتاب وسنت کا دور ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی زندگی کے نمونے موجود ہیں، بشارت رحمت وبخشش پہلے ہی سنا دی گئی ہے، تبلیغ دین، حفظ دین اور جہاد وقتال کا دور دورہ ہے استحبابی امور کی تلاش اور فروع کیلئے وقت ہی کہاں ہے یہ دور تو منصوصات کا ہے، احکامات کی عمل داری کا دور ہے، دینی معاملات پر خصوصی توجہ کا دور ہے، دین سے دوری کا تصور تک نہیں، احوال زمانہ محتاج اصلاح نہ ہیں تعلیم وتعلم کا دور ہے، ہر شخص کو یہی فکر دامن گیر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن وسنت کے اصول اپنے سینے میں جمع کرے اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے نادر نمونے پیش کرے، ایسے نورانی اور عرفانی ماحول مین اذان برقبر جیسے مستحب امر کی فکر کس کو دامن گیر ہو سکتی ہے؟

قرون اولیٰ میں اذان برقبر کی عدم موجودگی اس کے امر ضلالۃ ہونے کو مستلزم نہیں کیونکہ اس اذان کو نومولود کی اذان پر قیاس کرتے ہوئے سنت کہا گیا ہے، اذان نومولود نقل متواتر سے چلی آرہی ہے، اس کا انکار اور اس سے اختلاف کرنا ممکن نہیں، جس طرح انکار اور اختلاف ممکن نہیں اس طرح فقہاء متاخرین کے قیاسی فقہی مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنا

ممکن نہیں ،اجتہاد اور استنباط کیلئے حدیث صحیح بلا معارض کا ہونا ضروری ہے ،اگر چہ اس کی تائید کسی نص قرآنی سے نہ ہوتی ہو،

علامہ شامی نے فرمایا:"ماصح فیه الخیر بلا معارض فهو مذهب للمجتهد و ان لم ینص علیه" اس کلیہ کے تحت اذان نومولود اور اذان برقبر کے خلاف کوئی معارض حدیث موجود نہیں ،لہذا قیاس اور استنباط کیلئے ہر دو احادیث اساس کا درجہ رکھتی ہیں ،انہی دو حدیثوں کو بنیاد بناتے ہوئے فقہاء نے قیاس کیا اور اذان برقبر کو سنت کہا،

اذان انس اور طمانیت کا باعث ہے ،تذکیر اور تعلیم کا ذریعہ ہے بندہ مومن قبر میں پتھر کی طرح نہیں کہ سنتا ہو، نہ ادراک رکھتا ہوا، وہ سنتا ،دیکھتا اور بندوں کی دعا ذکر اور تلاوت وغیرہ سے مانوس ہوتا ہے جیسا کہ اثار اور احادیث سے ثابت ہے، محقق ابن الھمام صحرا میں دی جانے والی اذان کے فوائد، ثمرات اور عظمت شان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :" ومن الا اعلان بهذا الذکر نشر الذکر الله تعالیٰ و دنیه فی ارضه وتذکیر العباده من الجن و الانس الذین لا یری شخصهم فی الفلوات من العباد" (فتح القدیر)

صحرا اور جنگل میں اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان ذکر اللہ ہے اللہ کی زمین میں اس کے ذکر اور دین کو نشر کرنا ہے اللہ کے بندوں جن اور انسانوں کو اذان کے ذریعے یاد دہانی کرانا مقصود ہے، وہ جن اور انسان جن کا وجود صحراؤں اور جنگلوں میں دکھائی نہیں دیتا،،

سبحان اللہ محقق ابن الھمام نے کس قدر ایمان افروز ارشادات فرمائے ہیں ،(۱) اذان اللہ کا ذکر ہے ،ذکر الٰہی بندہ مومن کیلئے باعث اطمینان اور باعث انس ہے، حدیث عمرو بن العاص میں صراحت ہے کہ تمہارے ذکر اللہ کرنے سے مجھے انس حاصل ہوگا ،اور جوابات دینے میں آسانی رہے گی،

اذان دین ہے، علامت دین ہے، شعائر اسلام میں سے ہے میت کی قبر پر اذان دینا اس کو دین کی تعلیم دینا اور یاد دہانی کرانا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرے ہوئے مسلمان کو

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین کو خیر امت فرمایا ہے، جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یہ حضرات انوار قرآن، اور انوار رسالت سے روشن اور منور ہیں، بد عملی فساد عقیدہ کا تصور تک موجود نہیں، ان ادوار کے شب وروز اطاعت خداوندی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شعاعوں سے تابناک ہیں،، ان ادوار میں علم معرفت، عبادت، ریاضت، سیرت اور کردار کے اجالے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، ہر مومن اپنے سر پر خیر امتی کا تاج سجائے منزل قرب ورضا کی طرف رواں دواں ہے وہ ادوار جن کے متعلق لوگوں نے زبان رسالت سے خیر امتی کی بشارت سن رکھی ہے ان کی بخشش اور ان لوگوں کیلئے طلب رحمت یا مغفرت کی استدعا کرنے کی کیا حاجت ہے؟

صحابہ اور تابعین کا دور تشریحات کتاب وسنت کا دور ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی زندگی کے نمونے موجود ہیں، بشارت رحمت و بخشش پہلے ہی سنا دی گئی ہے، تبلیغ دین، حفظ دین اور جہاد وقتال کا دور دورہ ہے استحبابی امور کی تلاش اور فروع کیلئے وقت ہی کہاں ہے یہ دور تو منصوصات کا ہے، احکامات کی عمل داری کا دور ہے، دینی معاملات پر خصوصی توجہ کا دور ہے، دین سے دوری کا تصور تک نہیں، احوال زمانہ محتاج اصلاح نہ ہیں تعلیم و تعلم کا دور ہے، ہر شخص کو یہی فکر دامن گیر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن وسنت کے اصول اپنے سینے میں جمع کرے اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے نادر نمونے پیش کرے، ایسے نورانی اور عرفانی ماحول مین اذان برقبر جیسے مستحب امر کی فکر کس کو دامن گیر ہو سکتی ہے؟

قرون اولیٰ میں اذان برقبر کی عدم موجودگی اس کے امر ضلالۃ ہونے کو مستلزم نہیں کیونکہ اس اذان کو نومولود کی اذان پر قیاس کرتے ہوئے سنت کہا گیا ہے، اذان نومولود نقل متواتر سے چلی آ رہی ہے، اس کا انکار اور اس سے اختلاف کرنا ممکن نہیں، جس طرح انکار اور اختلاف ممکن نہیں اس طرح فقہاء متاخرین کے قیاسی فقہی مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنا

ممکن نہیں ،اجتہاد اور استنباط کیلئے حدیث صحیح بلا معارض کا ہونا ضروری ہے،اگرچہ اس کی تائید کسی نص قرآنی سے نہ ہوتی ہو،

علامہ شامی نے فرمایا:"ماصح فیه الخبر بلا معارض فهو مذهب للمجتهد وان لم ینص علیه" اس کلیہ کے تحت اذان نومولود اور اذان برقبر کے خلاف کوئی معارض حدیث موجود نہیں ،لہذا قیاس اور استنباط کیلئے ہر دو احادیث اساس کا درجہ رکھتی ہیں،انہی دو حدیثوں کو بنیاد بناتے ہوئے فقہاء نے قیاس کیا اور اذان برقبر کو سنت کہا،

اذان انس اور طمانیت کا باعث ہے،تذکیر اور تعلیم کا ذریعہ ہے بندہ مومن قبر میں پتھر کی طرح نہیں کہ سنتا ہو،نہ ادراک رکھتا ہوا،وہ سنتا،دیکھتا اور بندوں کی دعا ذکر اور تلاوت وغیرہ سے مانوس ہوتا ہے جیسا کہ اثار اور احادیث سے ثابت ہے، محقق ابن الہمام صحرا میں دی جانے والی اذان کے فوائد،ثمرات اور عظمت شان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :"ومن الا اعلان بهذا الذكر نشر الذكر الله تعالىٰ و دنيه فى ارضه وتذكير االعباده من الجن و الانس الذين لا يرى شخصهم فى الفلوات من العباد" (فتح القدير)

صحرا اور جنگل میں اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان ذکر اللہ ہے اللہ کی زمین میں اس کے ذکر اور دین کو نشر کرنا ہے اللہ کے بندوں جن اور انسانوں کو اذان کے ذریعے یاددہانی کرانا مققصود ہے،وہ جن اور انسان جن کا وجود صحراؤں اور جنگلوں میں دکھائی نہیں دیتا،،

سبحان اللہ محقق ابن الہمام نے کس قدر ایمان افروز ارشادات فرمائے ہیں،(۱) اذان اللہ کا ذکر ہے ،ذکر الٰہی بندہ مومن کیلئے باعث اطمینان اور باعث انس ہے،حدیث عمرو بن العاص میں صراحت ہے کہ تمہارے ذکر اللہ کرنے سے مجھے انس حاصل ہوگا،اور جوابات دینے میں آسانی رہے گی،

اذان دین ہے،علامت دین ہے،شعائر اسلام میں سے ہے میت کی قبر پر اذان دینا اس کو دین کی تعلیم دینا اور یاددہانی کرانا ہے،خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرے ہوئے مسلمان کو

ممکن نہیں، اجتہاد اور استنباط کیلئے حدیث صحیح بلا معارض کا ہونا ضروری ہے، اگر چہ اس کی تائید کسی نص قرآنی سے نہ ہوتی ہو،

علامہ شامی نے فرمایا: "ماصح فیہ الخیر بلا معارض فھو مذھب للمجتھد وان لم ینص علیہ" اس کلیہ کے تحت اذان نومولود اور اذان بر قبر کے خلاف کوئی معارض حدیث موجود نہیں ،لہذا قیاس اور استنباط کیلئے ہر دو احادیث اساس کا درجہ رکھتی ہیں، انہی دو حدیثوں کو بنیاد بناتے ہوئے فقہاء نے قیاس کیا اور اذان بر قبر کو سنت کہا،

اذان انس اور طمانیت کا باعث ہے، تذکیر اور تعلیم کا ذریعہ ہے بندہ مومن قبر میں پتھر کی طرح نہیں کہ سنتا ہو، نہ ادراک رکھتا ہوا، وہ سنتا، دیکھتا اور بندوں کی دعا ذکر اور تلاوت وغیرہ سے مانوس ہوتا ہے جیسا کہ اثار اور احادیث سے ثابت ہے، محقق ابن الہمام صحرا میں دی جانے والی اذان کے فوائد، ثمرات اور عظمت شان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "ومن الااعلان بھذا الذکر نشرا الذکر اللہ تعالیٰ ودنیہ فی ارضہ وتذکیرا العبادہ من الجن والانس الذین لایری شخصھم فی الفلوات من العباد" (فتح القدیر)

صحرا اور جنگل میں اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان ذکر اللہ ہے اللہ کی زمین میں اس کے ذکر اور دین کو نشر کرنا ہے اللہ کے بندوں جن اور انسانوں کو اذان کے ذریعے یاد دہانی کرانا مققصود ہے، وہ جن اور انسان جن کا وجود صحراؤں اور جنگلوں میں دکھائی نہیں دیتا،،

سبحان اللہ محقق ابن الہمام نے کس قدر ایمان افروز ارشادات فرمائے ہیں، (۱) اذان اللہ کا ذکر ہے ،ذکر الٰہی بندہ مومن کیلئے باعث اطمینان اور باعث انس ہے، حدیث عمرو بن العاص میں صراحت ہے کہ تمہارے ذکر اللہ کرنے سے مجھے انس حاصل ہوگا، اور جوابات دینے میں آسانی رہے گی،

اذان دین ہے، علامت دین ہے، شعائر اسلام میں سے ہے میت کی قبر پر اذان دینا اس کو دین کی تعلیم دینا اور یاد دہانی کرانا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرے ہوئے مسلمان کو

ممکن نہیں ،اجتہاد اور استنباط کیلئے حدیث صحیح بلا معارض کا ہونا ضروری ہے ،اگرچہ اس کی تائید کسی نص قرآنی سے نہ ہوتی ہو،

علامہ شامی نے فرمایا:"ماصح فیه الخیر بلا معارض فھو مذھب للمجتھد وان لم ینص علیه" اس کلیہ کے تحت اذان نومولود اور اذان بر قبر کے خلاف کوئی معارض حدیث موجود نہیں ،لہذا قیاس اور استنباط کیلئے ہر دو احادیث اساس کا درجہ رکھتی ہیں ،انہی دو حدیثوں کو بنیاد بناتے ہوئے فقہاء نے قیاس کیا اور اذان بر قبر کو سنت کہا،

اذان انس اور طمانیت کا باعث ہے ،تذکیر اور تعلیم کا ذریعہ ہے بندہ مومن قبر میں پتھر کی طرح نہیں کہ سنتا ہو ،نہ ادراک رکھتا ہوا ،وہ سنتا ،دیکھتا اور بندوں کی دعا ذکر اور تلاوت وغیرہ سے مانوس ہوتا ہے جیسا کہ اثار اور احادیث سے ثابت ہے، محقق ابن الہمام صحرا میں دی جانے والی اذان کے فوائد ،ثمرات اور عظمت شان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :"ومن الا اعلان بھذا الذکر نشرا الذکر اللہ تعالیٰ ودنیه فی ارضه وتذ کیرا العباده من الجن والانس الذین لا یری شخصھم فی الفلوات من العباد" (فتح القدیر)

صحرا اور جنگل میں اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان ذکر اللہ ہے اللہ کی زمین میں اس کے ذکر اور دین کو نشر کرنا ہے اللہ کے بندوں جن اور انسانوں کو اذان کے ذریعے یاددہانی کرانا مققصود ہے ،وہ جن اور انسان جن کا وجود صحراؤں اور جنگلوں میں دکھائی نہیں دیتا،،

سبحان اللہ محقق ابن الہمام نے کس قدر ایمان افروز ارشادات فرمائے ہیں ،(۱) اذان اللہ کا ذکر ہے ،ذکر الٰہی بندہ مومن کیلئے باعث اطمینان اور باعث انس ہے ،حدیث عمرو بن العاص میں صراحت ہے کہ تمہارے ذکر اللہ کرنے سے مجھے انس حاصل ہوگا ،اور جوابات دینے میں آسانی رہے گی،

اذان دین ہے ،علامت دین ہے ،شعائر اسلام میں سے ہے میت کی قبر پر اذان دینا اس کو دین کی تعلیم دینا اور یاددہانی کرانا ہے ،خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مرے ہوئے مسلمان کو

تلقین کرتے ہوئے کہو کہ اے فلاں بن فلاں تو اپنے دین کو یاد کر جس دین میں تو دنیا میں تھا، اس معنی میں اذان تلقین کے پورے مضمون اور مفہوم کو جامع ہے، کیونکہ تلقین میں کلمہ توحید اور کلمہ شہادت کا ذکر بھی ہے، اور دونوں کلمات من جملہ کلمات اذان میں موجود ہیں،،

(۲) اللہ تعالیٰ کی زمین میں ذکر اللہ کو نشر کرنا ہے زمین او پر سے لیکر تحت الثریٰ تک ہے، سطح زمین پر دی جانے والی اذان کی آواز جہاں زمین کے اوپر سنائی دے رہی ہے وہاں زمین کے اندر موجود انسانی مخلوق کو بھی سنائی دے رہی ہے، جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ اذان دین اور ذکر الٰہی ہونے کے ناطے زمین کے اوپر اور زمین کے اندر بھی نشر ہو کر یاد دہانی کرا رہی ہے اور جس طرح جنگلوں صحراؤں مین موجود جن اور انسانوں (جو دکھائی نہیں دیتے) کیلئے ذکر، دین، اور فرض کی یاد دہانی ہے، اس طرح قبر میں موجود بندہ مومن اب ہمیں نظر نہیں آ رہا اس کیلئے بھی اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اس کے دین کی یاد دہانی کراتی ہے،،

صحراء اور جنگل میں اذان دینے کا اگر یہ مقصد ہے تو کیا میت کے انس، طمانیت، یاد دہانی کیلئے قبر پر اذان دینا بے مقصد اور غیر مفید ہے، تدبر و تفکر،،

مولف کتابچہ کی طرف سے یہ سوال بھی سامنے آیا کہ، انس، طمانیت، اور یاد دہانی وغیرہ کیلئے اذان کو کیوں مختص کیا گیا ہے،

اختصار کی وجہ یہ ہے کہ اذان کی برکت سے منتہائے آواز تک مومنوں کی بخشش حدیث سے ثابت ہے، اور اس کے اثرات زندوں کے علاوہ مردوں تک بھی پہنچتے ہیں، پھر یہ کہ اذان تمام اعتقادی مسائل کا مجموعہ ہے اذان دینے سے صحت اعتقاد، اور امور مشروعہ پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے، امام ابن حجر عسقلانی، امام قرطبی کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ: "الا ذان علی قلة الفاظه مشتمل علی مسائل العقیده، لا نه بدء تنضمن بالا کبریة وهی تنضمن و جو د الله و کماله ثم ثنی بالتو حید و نفی الشر ک ثم باثبات الر سالة لمحمد صلی الله علیه

وسلم، ثم دعا الى الطاعة المخصوصة عقب الشهادة بالرسالة لا تعرف الا من جهة الرسول ثم دعا الى الفلاح وهو البقاء الدائم وفيه الاشارة الى المعاد" (فتح الباری)

اگر چہ اذان کے الفاظ کم ہیں مگر اس کے باوجود عقائد کے تمام مسائل اس میں موجود ہیں، مثلاً اذان اللہ کی ذات، اس کے کمالات پر مشتمل ہے پھر توحید کی صفت اور شرک کی نفی موجود ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا تذکرہ ہے، پھر مخصوص عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، کلمہ شہادت بالرسالۃ کے بعد عبادت کی طرف دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ عبادت کا تصور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرہون منت ہے، پھر فلاں یعنی دائمی کامیابی حاصل کرنے کی طرف پیغام ہے اور وہ کامیابی بقائے دوام ہے، اور اذان میں ہی قیامت اور حشر، نشر کا ذکر ہے،،

امام ابن حجر عسقلانی نے امام قرطبی رحمہا اللہ کا محققانہ اقتباس نقل فرمایا ہے، کروڑوں رحمتیں نازل ہوں فقہائے امت اور محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مزار ہائے مقدسہ پر جنہوں نے نور بصیرت سے دین متین کے مخفی گوشوں کو آشکار افرمایا، روح دین سمجھانے اور پھیلانے کیلئے زندگی کا ہر لمحہ وقف کیے رکھا، ان نفوس قدسیہ کا ہر عمل خدمت دین کا نشان تھا یہی وہ مقدس شخصیات ہیں جن کے قلم سے رشد وہدایت کے سوتے پھوٹے، محدثین نے احادیث کی تدوین کیلئے کرہ ارضی کا ذرہ ذرہ چھان مارا، اصول حدیث میں سند کی صحت احوال راوی جیسے دقیق مسائل سے متن حدیث میں نکھار پیدا کیا، فرامین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام فہم بنانے کیلئے ان کی شروحات لکھیں، اور فہم وادراک سے وراء الوری مضامین حدیث کو سہل اور قابل استفادہ فرمایا، صحاح ستہ کے مولفین، آئمہ مجتہدین، محدثین اور شراح حضرات کی طویل فہرست ہے لیکن ان میں امام ابن حجر عسقلانی، امام بدرالدین عینی، امام نووی، ملا علی قاری، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، امام عزالدین بن عبد السلام، محقق ابن الہمام، صاحب ہدایہ، علامہ ابن عابدین شامی جیسی بلند مرتبت علمی اور تحقیقی شخصیات کی علمی خدمات قیام قیامت تک یاد رکھی جائینگی، یہی وہ مینارہ ہائے نور ہین جن کی روشنی

تلقین کرتے ہوئے کہو کہ اے فلاں بن فلاں تو اپنے دین کو یاد کر جس دین میں تو دنیا میں تھا، اس معنی میں اذان تلقین کے پورے مضمون اور مفہوم کو جامع ہے، کیونکہ تلقین میں کلمہ توحید اور کلمہ شہادت کا ذکر بھی ہے، اور دونوں کلمات من جملہ کلمات اذان میں موجود ہیں،،

(۲) اللہ تعالیٰ کی زمین میں ذکر اللہ کو نشر کرنا ہے زمین اوپر سے لیکر تحت الثریٰ تک ہے، سطح زمین پر دی جانے والی اذان کی آواز جہاں زمین کے اوپر سنائی دے رہی ہے وہاں زمین کے اندر موجود انسانی مخلوق کو بھی سنائی دے رہی ہے، جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ اذان دین اور ذکر الٰہی ہونے کے ناطے زمین کے اوپر اور زمین کے اندر بھی نشر ہو کر یاد دہانی کرا رہی ہے اور جس طرح جنگلوں صحراؤں مین موجود جن اور انسانوں (جو دکھائی نہیں دیتے) کیلئے ذکر، دین، اور فرض کی یاددہانی ہے، اس طرح قبر میں موجود بندہ مومن اب ہمیں نظر نہیں آ رہا اس کیلئے بھی اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے دین کی یاددہانی کراتی ہے،،

صحراء اور جنگل میں اذان دینے کا اگر یہ مقصد ہے تو کیا میت کے انس، طمانیت، یاددہانی کیلئے قبر پر اذان دینا بے مقصد اور غیر مفید ہے، تدبر و تفکر،،

مولف کتابچہ کی طرف سے یہ سوال بھی سامنے آیا کہ، انس، طمانیت، اور یاددہانی وغیرہ کیلئے اذان کو کیوں مختص کیا گیا ہے،

اختصار کی وجہ یہ ہے کہ اذان کی برکت سے منتہائے آواز تک مومنوں کی بخشش حدیث سے ثابت ہے، اور اس کے اثرات زندوں کے علاوہ مردوں تک بھی پہنچتے ہیں، پھر یہ کہ اذان تمام اعتقادی مسائل کا مجموعہ ہے اذان دینے سے صحت اعتقاد، اور امور مشروعہ پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے، امام ابن حجر عسقلانی، امام قرطبی کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ: "الا ذان علی قلة الفاظه مشتمل علی مسائل العقیده، لا نه بدء تنضمن بالا کبریة وهی تنضمن و جو د الله و کماله ثم ثنی بالتو حید و نفی الشر ک ثم باثبات الر سالة لمحمد صلی الله علیه

وسلم، ثم دعا الی الطاعة المخصوصة عقب الشهادة بالرسالة لا تعرف الا من جهة الرسول ثم دعا الی الفلاح وهو البقاء الدائم وفیه الاشارة الی المعاد" (فتح الباری)

اگرچہ اذان کے الفاظ کم ہیں مگر اس کے باوجود عقائد کے تمام مسائل اس میں موجود ہیں، مثلاً اذان اللہ کی ذات، اس کے کمالات پر مشتمل ہے پھر توحید کی صفت اور شرک کی نفی موجود ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا تذکرہ ہے، پھر مخصوص عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، کلمہ شہادت بالرسالۃ کے بعد عبادت کی طرف دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ عبادت کا تصور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مرہون منت ہے، پھر فلاں یعنی دائمی کامیابی حاصل کرنے کی طرف پیغام ہے اور وہ کامیابی بقائے دوام ہے، اور اذان میں ہی قیامت اور حشر،نشر کا ذکر ہے"۔

امام ابن حجر عسقلانی نے امام قرطبی رحمہا اللہ کا محققانہ اقتباس نقل فرمایا ہے، کروڑوں رحمتیں نازل ہوں فقہائے امت اور محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مزار ہائے مقدسہ پر جنہوں نے نور بصیرت سے دین متین کے مخفی گوشوں کو آشکار افرمایا، روح دین سمجھانے اور پھیلانے کیلئے زندگی کا ہر لمحہ وقف کیے رکھا، ان نفوس قدسیہ کا ہر عمل خدمت دین کا نشان تھا یہی وہ مقدس شخصیات ہیں جن کے قلم سے رشد وہدایت کے سوتے پھوٹے، محدثین نے احادیث کی تدوین کیلئے کرہ ارضی کا ذرہ ذرہ چھان مارا، اصول حدیث میں سند کی صحت احوال راوی جیسے دقیق مسائل سے متن حدیث میں نکھار پیدا کیا، فرامین رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عام فہم بنانے کیلئے ان کی شروحات لکھیں، اور فہم وادراک سے وراء الوریٰ مضامین حدیث کو سہل اور قابل استفادہ فرمایا، صحاح ستہ کے مولفین، آئمہ مجتہدین، محدثین اور شراح حضرات کی طویل فہرست ہے لیکن ان میں امام ابن حجر عسقلانی، امام بدرالدین عینی، امام نووی، ملا علی قاری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، امام عزالدین بن عبد السلام، محقق ابن الہمام، صاحب ہدایہ، علامہ ابن عابدین شامی جیسی بلند مرتبت علمی اور تحقیقی شخصیات کی علمی خدمات قیام قیامت تک یاد رکھی جائینگی، یہی وہ مینارہ ہائے نور ہیں جن کی روشنی

سے دنیا آج بھی مستفیض اور مستفید ہو رہی ہے، مولف نے اپنی تالیف کا نام اذان برقبر اہل سنت کی نظر میں رکھا، اس میں کیا علمی کارنامہ ہے؟ صرف یہ کہ اذان برقبر بدعت ہے، اور گمراہی ہے، اہل سنت کون ہیں؟ صرف دو شخص ایک مولف اور دوسرا اویس خان ایوبی، مفتی ضلع میر پو، مولف نے اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ تمام اہل سنت کے متفقہ موقف پر کہا ہے، جس کا تقاضا تھا کہ اہل سنت کے مشاہیر فقہاء اور محدثین کی تصریحات اذان برقبر کے بدعت ضلالۃ ہونے پر پیش کرتے کسی مفسر کا قول نقل کرتے، کسی کتاب کا حوالہ پیش کرتے، ہمارے نقل کردہ دلائل کی تردید نقلی دلائل سے کرتے، مگر پورے کتابچہ میں کسی جگہ کوئی حدیث صریح یا قول فقیہ بدعت کے عنوان پر نقل نہیں کر سکے، صرف ہماری نقل کرتے ہوئے لکھا کہ ابن حجر اذان برقبر کو بدعت کہتے ہیں، پھر راقم سے پوچھا کہ آپ کا علم زیادہ ہے یا ابن حجر کا تھک ہار کر غوث اعظم ،شاہ نقشبند، خواجہ اجمیری وغیرہ اولیائے عظام نے اذان دی نہ دلوائی وغیرہ وغیرہ،،

واویلا کی حد تک ان کو اختیار ہے وہ عدم جوازیت کے قائل ہین، اصولی طور پر دلیل ممانعت پیش کرنے کے وہ پابند ہیں، کیونکہ کسی کام کو بلا دلیل مکروہ کہنا بھی جائز نہیں، مکروہ ایک شرعی حکم ہے اس کو ثابت کرنے کیلئے دلیل نہی کی ضرورت ہے کما صرح فی فتاوی الشامی، ہر شیء تو اپنی اصلیت میں مباح ہے، جائز ہے اس کی پوری تفصیل ہمارے رسالہ مسئلہ اذان برقبر کے، ص ۲۴، پر بیان کی گئی ہے، جب مکروہ کو بغیر دلیل شرعی مکروہ کہنا غلط ہے تو چہ جائیکہ بغیر ثبوت نقلی کسی جائز کام کو بدعت ضلالۃ کہا جائے، کیا کوئی اہل علم مسلمان ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تصور کر سکتا ہے، کہ محدثین اور فقہاء نے بدعت کی تعریف اور جو اقسام بیان کی ہیں، وہ منافی قرآن وسنت ہیں، جو ایمان کی بنیاد اور اسلام کی جڑ ہیں، اذان میں توحید، رسالت، نماز، قیامت اور مابعد القیامت کے حالات کو سمیٹا گیا ہے قبر میں پوچھے جانے والے سوالات کا تعلق بھی توحید، رسالت، اور دین سے ہے ،قبر میں میت کوئی بھی ہو سوالات میں یکسانیت ہے، اذان کی عظمت اور شناخت سے ان پڑھ

آدمی بھی واقف ہوتا ہے، کم از کم اس کو اتنا پتہ ضرور ہوتا ہے، کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کی پکار ہے، اور نماز کیلئے دعوت ہے، یہی شخص جب قبر کے اوپر سے آواز سنے گا تو اس کو اپنا عقیدہ اور وہ جذبات ایمانی اس کو یاد نہیں آئینگے؟

بعد از دفن قبر پر جو عمل کیا گیا سب کا مقصد اور مآل میت کیلئے سامان راحت پیدا کرنا ہے، تسبیح ہو یا تکبیر، ذکر، دعا، یا استغفار، کھجور کی ٹہنیوں کا گاڑنا ہو یا دعائے ثبات سب کا مقصد مغفرت اور طمانیت ہے، اذان ان تمام مقاصد کی جامع ہے، یہ بدعت ضلالۃ کیسے ہوسکتی ہے؟ مولف نے کہا کہ خواجہ اجمیری، خواجہ نقشبند کا حوالہ پیش کرو،

مولف کو اس سوچ کا ماتم کرنا چاہیے کیونکہ، سنت، مباح، بدعت وغیرہ فقہ کے موضوعات ہیں، فقیہہ افعال مکلفین سے بحث کرتا ہے یعنی وہ فرض، واجب، سنت، مباح جیسے احکام کو زیر بحث لاتا ہے یہ احکامات شرعیہ ہیں، جبکہ اولیاء اور صوفیاء کا موضوع اقوال نہیں بلکہ احوال ہیں، اقوال کتاب وسنت، اجماع امت اور قیاس کا نام ہے، احوال، امور باطنیہ ہیں، باطنی کیفیات کا نام احوال ہے جو ریاضت اور عبادات کے ذریعے فضل الٰہی سے نصیب ہوتے ہیں، امور باطنیہ ہونے کے علاوہ مخصوص بفرد یا افراد ہوتے ہیں، ان کا ترک اور انکار کفر نہیں، قال کو حال پر ترجیح حاصل ہے اور حال کا ماخذ قال ہی ہے، اولیاء اور صوفیاء کے نزدیک اذان برقبر کا وجود ہو یا نہ ہو؟ دوسروں کیلئے حجت نہیں، حجت قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس ہے، اذان برقبر فقہ سے ثابت ہے علم الاحوال سے ثابت نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، مولف کتابچہ نے کتابچہ کے، ص، ۱۱، ۱۲، پر اتباع سنت پر زور دیا ہے، واضح رہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور محبت رسول اللہ ﷺ کا حصول اجزائے ایمان ہیں، کوئی مومن ان سے انحراف اور اعراض نہیں کرسکتا، لیکن سوال یہ ہے اذان برقبر کے بارے میں سنت کیا ہے؟ اذان دینا یا نہ دینا؟ مولف کتابچہ نے سنت رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل، اور پسند کو کہا ہے اب یہ پوچھنا مقصود ہے کہ رسول اللہ

سے دنیا آج بھی مستفیض اور مستفید ہو رہی ہے، مولف نے اپنی تالیف کا نام اذان بر قبر اہل سنت کی نظر میں رکھا، اس میں کیا علمی کارنامہ ہے؟ صرف یہ کہ اذان بر قبر بدعت ہے، اور گمراہی ہے، اہل سنت کون ہیں؟ صرف دو شخص ایک مولف اور دوسرا اویس خان ایوبی، مفتی ضلع میر پو، مولف نے اذان بر قبر کو بدعت ضلالۃ تمام اہل سنت کے متفقہ موقف پر کہا ہے، جس کا تقاضا تھا کہ اہل سنت کے مشاہیر فقہاء اور محدثین کی تصریحات اذان بر قبر کے بدعت ضلالۃ ہونے پر پیش کرتے کسی مفسر کا قول نقل کرتے، کسی کتاب کا حوالہ پیش کرتے، ہمارے نقل کردہ دلائل کی تردید نقلی دلائل سے کرتے، مگر پورے کتابچہ میں کسی جگہ کوئی حدیث صریح یا قول فقیہ بدعت کے عنوان پر نقل نہیں کر سکے، صرف ہماری نقل کرتے ہوئے لکھا کہ ابن حجر اذان بر قبر کو بدعت کہتے ہیں، پھر راقم سے پوچھا کہ آپ کا علم زیادہ ہے یا ابن حجر کا تھک ہار کر غوث اعظم ،شاہ نقشبند، خواجہ اجمیری وغیرہ اولیائے عظام نے اذان دی نہ دلوائی وغیرہ وغیرہ،،

واویلا کی حد تک ان کو اختیار ہے وہ عدم جوازیت کے قائل ہین، اصولی طور پر دلیل ممانعت پیش کرنے کے وہ پابند ہیں، کیونکہ کسی کام کو بلا دلیل مکروہ کہنا بھی جائز نہیں، مکروہ ایک شرعی حکم ہے اس کو ثابت کرنے کیلئے دلیل نہی کی ضرورت ہے کما صرح فی فتاوی الشامی، ہر شیءتو اپنی اصلیت میں مباح ہے، جائز ہے اس کی پوری تفصیل ہمارے رسالہ مسئلہ اذان بر قبر کے، ص ۲۴، پر بیان کی گئی ہے، جب مکروہ کو بغیر دلیل شرعی مکروہ کہنا غلط ہے تو چہ جائیکہ بغیر ثبوت نقلی کسی جائز کام کو بدعت ضلالۃ کہا جائے، کیا کوئی اہل علم مسلمان ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تصور کر سکتا ہے، کہ محدثین اور فقہاء نے بدعت کی تعریف اور جو اقسام بیان کی ہیں، وہ منافی قرآن وسنت ہیں، جو ایمان کی بنیاد اور اسلام کی جڑ ہیں، اذان میں توحید، رسالت، نماز، قیامت اور مابعد القیامت کے حالات کو سمیٹا گیا ہے قبر میں پوچھے جانے والے سوالات کا تعلق بھی توحید، رسالت، اور دین سے ہے ،قبر میں میت کوئی بھی ہو سوالات میں یکسانیت ہے، اذان کی عظمت اور شناخت سے ان پڑھ

آدمی بھی واقف ہوتا ہے، کم از کم اس کو اتنا پتہ ضرور ہوتا ہے، کہ اس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کی پکار ہے، اور نماز کیلئے دعوت ہے، یہی شخص جب قبر کے اوپر سے آواز سنے گا تو اس کو اپنا عقیدہ اور وہ جذبات ایمانی اس کو یاد نہیں آئینگے؟

بعد از دفن قبر پر جو عمل کیا گیا سب کا مقصد اور مآل میت کیلئے سامان راحت پیدا کرنا ہے، تسبیح ہو یا تکبیر، ذکر، دعا، یا استغفار، کھجور کی ٹہنیوں کا گاڑنا ہو یا دعائے ثبات سب کا مقصد مغفرت اور طمانیت ہے، اذان ان تمام مقاصد کی جامع ہے، یہ بدعت ضلالۃ کیسے ہوسکتی ہے؟ مولف نے کہا کہ خواجہ اجمیری، خواجہ نقشبند کا حوالہ پیش کرو،

مولف کو اس سوچ کا ماتم کرنا چاہیے کیونکہ، سنت، مباح، بدعت وغیرہ فقہ کے موضوعات ہیں، فقیہہ افعال مکلفین سے بحث کرتا ہے یعنی وہ فرض، واجب، سنت، مباح جیسے احکام کو زیر بحث لاتا ہے یہ احکامات شرعیہ ہیں، جبکہ اولیاء اور صوفیاء کا موضوع اقوال نہیں بلکہ احوال ہیں، اقوال کتاب وسنت، اجماع امت اور قیاس کا نام ہے، احوال، امور باطنیہ ہیں، باطنی کیفیات کا نام احوال ہے جو ریاضت اور عبادت کے ذریعے فضل الٰہی سے نصیب ہوتے ہیں، امور باطنیہ ہونے کے علاوہ مخصوص بفرد یا افراد ہوتے ہیں، ان کا ترک اور انکار کفر نہیں، قال کو حال پر ترجیح حاصل ہے اور حال کا ماخذ قال ہی ہے، اولیاء اور صوفیاء کے نزدیک اذان برقبر کا وجود ہو یا نہ ہو؟ دوسروں کیلئے حجت نہیں، حجت قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس ہے، اذان برقبر فقہ سے ثابت ہے علم الاحوال سے ثابت نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، مولف کتابچہ نے کتابچہ کے، ص، ۱۱، ۱۲، پر اتباع سنت پر زور دیا ہے، واضح رہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصول اجزائے ایمان ہیں، کوئی مومن ان سے انحراف اور اعراض نہیں کرسکتا، لیکن سوال یہ ہے اذان برقبر کے بارے میں سنت کیا ہے؟ اذان دینا یا نہ دینا؟ مولف کتابچہ نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول، فعل، اور پسند کو کہا ہے اب یہ پوچھنا مقصود ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول ،کوئی فعل بتائیں جس میں اذان برقبر کی ممانعت موجود ہو یا آپ کی پسند اذان نہ دینا ہو، مانعین اذان برقبر کے پاس کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ،صرف اپنی قیاس آرائیاں اور خود ساختہ ٹوٹکے ہیں ، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ،تابعین رضی اللہ عنہم نے اذان دی نہ دلوائی۔

مگر نہ اذان دینے اور نہ دلوانے سے اذان برقبر کی ممانعت اور اس کا ضلالۃ ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کا وجود ان مبارک ادوار میں نہ تھا، مگر علماء اور فقہاء نے اس پر عمل پیرا اور لوگوں کو ان پر تحریض اور تحریص دلائی ہے اور وہ امور جن کے بارے میں جواز یا عدم جواز کا کوئی پہلو واضح نہ ہو وہ عفو کے حکم میں ہوتے ہیں ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ اشیاء کھالیتے اور کچھ ناپسند سمجھ کر چھوڑ دیا کرتے تھے ، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا ، قرآن نازل فرمایا ، حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دیا،

اور جن اشیاء کے بارے میں سکوت فرمایا وہ درجہ عفو میں ہیں ، (ابوداؤد) یعنی وہ امور جو سکوت عنہا کے درجے میں ہیں مباح ہیں قابل معافی ہیں قابل مواخذہ نہیں ، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اذان برقبر بدعت ہے تو بھی اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط اور اصول قرآن کے خلاف ہے ،حضرت عبداللہ بن عباس کے فرمان کے مطابق جواز عدم جواز ،حلال ،حرام کا کلیہ بیان ہو چکا ، جن اشیاء پر حلال ،حرام کا حکم آیا وہ حلال یا حرام ہیں ، جن کے بارے میں کوئی حکم نافذ نہیں ، قرآن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت فرمایا وہ معاف ہے ،، قابل مواخذہ نہیں ،اذان برقبر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول ، فعل نفیاً یا اثباتاً موجود نہیں اس لئے یہ درجہ عفو میں ہے ، مباح ہے عفو اور مباح کو حرام ناجائز ، یا بدعت کہنے کیلئے دلیل شرعی کی ضرورت ہے ، بدعت ضلالۃ کا ارتکاب تو حرام ہے لہٰذا اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنے کیلئے نص قطعی کی

ضرورت ہے، اور وہ آیت ہے یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اگر اذان بر قبر کے امر ضلالت ہونے کا ثبوت یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ، تابعین کے زمانے میں اس کا وجود اور عمل نہ تھا، تو پھر بتائیں کہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال، خطبہ، اور اذان کیلیئے اس کا خصوصی استعمال، دور حاضر کی امامت خطابت، رہائش، لباس، ماہانہ، تنخواہ، تعلیم وتدریس کے فرائض پر وظیفہ خوری، اور من پسند اجرت قرون اولٰی میں تھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زخم کھا کر قرآنی تعلیمات سے ریگزار عرب کو روشن اور منور کیا، فرمایا "لا اسئلکم علیه اجرا الایه، زندگی بھر کوئی اجرا (الایۃ) مانگا نہ وظیفہ کی خواہش کی اور نہ مطالبہ کیا، خلفائے راشدین کو جو کفاف ماہانہ ملتا تھا وہ بحیثیت خلیفہ تھا نہ امام، خطیب اور مبلغ کے طور پر موجودہ دور کے آئمہ، خطباء مدرسین جو من مانی مراعات اور اجرت وصول کرتے ہیں کیا یہ بدعات نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر ان کا ارتکاب کیوں؟ یہ امور ضلالۃ نہیں؟ "فما جوایکم فھو جوابنا" خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب اذان بر قبر کی ممانعت پر کوئی قول، کوئی فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں اس کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط اور باطل محض ہے، بدعت ضلالۃ تو وہ چیز ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف اور معارض ہو بلکہ بقول امام شافعی جو کتاب وسنت، اثر صحابی اور اجماع امت کے خلاف ہو، بحمد للہ اذان بر قبر میں ایسی کوئی چیز نہیں،،

مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ فلاں محدث، فلاں امام، آئمہ وغیرہ کی قبور پر اذان نہیں ہوئی، مولف کو علم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں معاشرتی اور نجی زندگی، دنیا سے رحلت فرما جانے والے لوگوں کی زندگی کے تمام حالات اور واقعات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے ان کے نجی معاملات تک رسائی ناممکن، مشہور اور معروف ہونے کے باوجود یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے کارہائے حیات یہی ہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانبردار رہے ہیں ورنہ اتنا بلند مقام کا حصول ناممکن ہے،،، مولف کتابچہ نے کتابچہ کے

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول، کوئی فعل بتائیں جس میں اذان برقبر کی ممانعت موجود ہو یا آپ کی پسند اذان نہ دینا ہو، مانعین اذان برقبر کے پاس کوئی نقلی دلیل موجود نہیں، صرف اپنی قیاس آرائیاں اور خود ساختہ ٹوٹکے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ، تابعین رضی اللہ عنہم نے اذان دی نہ دلوائی۔

مگر نہ اذان دینے اور نہ دلوانے سے اذان برقبر کی ممانعت اور اس کا ضلالۃ ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کا وجود ان مبارک ادوار میں نہ تھا، مگر علماء اور فقہاء نے اس پر عمل پیرا اور لوگوں کو ان پر تحریض اور تحریص دلائی ہے اور وہ امور جن کے بارے میں جواز یا عدم جواز کا کوئی پہلو واضح نہ ہو وہ عفو کے حکم میں ہوتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ اشیاء کھالیتے اور کچھ ناپسند سمجھ کر چھوڑ دیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، قرآن نازل فرمایا، حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دیا،

اور جن اشیاء کے بارے میں سکوت فرمایا وہ درجہ عفو میں ہیں، (ابوداؤد) یعنی وہ امور جو سکوت عنہا کے درجے میں ہیں مباح ہیں قابل معافی ہیں قابل مواخذہ نہیں، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اذان برقبر بدعت ہے تو بھی اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہن غلط اور اصول قرآن کے خلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباس کے فرمان کے مطابق جواز عدم جواز، حلال، حرام کا کلیہ بیان ہو چکا، جن اشیاء پر حلال، حرام کا حکم آیا وہ حلال یا حرام ہیں، جن کے بارے میں کوئی حکم نافذ نہیں، قرآن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت فرمایا وہ معاف ہے،، قابل مواخذہ نہیں، اذان برقبر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول، فعل نفیاً یا اثباتاً موجود نہیں اس لئے یہ درجہ عفو میں ہے، مباح ہے عفو اور مباح کو حرام ناجائز، یا بدعت کہنے کیلئے دلیل شرعی کی ضرورت ہے، بدعت ضلالۃ کا ارتکاب تو حرام ہے لہٰذا اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنے کیلئے نص قطعی کی

ضرورت ہے، اور وہ آیت ہے یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اگر اذان برقبر کے امر ضلالت ہونے کا ثبوت یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ، تابعین کے زمانے میں اس کا وجود اور عمل نہ تھا، تو پھر بتائیں کہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال، خطبہ، اور اذان کیلئے اس کا خصوصی استعمال، دور حاضر کی امامت خطابت، رہائش، لباس، ماہانہ، تنخواہ، تعلیم وتدریس کے فرائض پر وظیفہ خوری، اور من پسند اجرت قرون اولیٰ میں تھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زخم کھا کر قرآنی تعلیمات سے ریگزار عرب کو روشن اور منور کیا، فرمایا "لا اسئلکم علیه اجرا الایه، زندگی بھر کوئی اجرا (الایۃ) مانگا نہ وظیفہ کی خواہش کی اور نہ مطالبہ کیا، خلفائے راشدین کو جو کفاف ماہانہ ملتا تھا وہ بحیثیت خلیفہ تھا نہ امام، خطیب اور مبلغ کے طور پر موجودہ دور کے آئمہ، خطباء مدرسین جو من مانی مراعات اور اجرت وصول کرتے ہیں کیا یہ بدعات نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر ان کا ارتکاب کیوں؟ یہ امور ضلالۃ نہیں؟ "فما جوابکم فھو جوابنا" خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب اذان برقبر کی ممانعت پر کوئی قول، کوئی فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں اس کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط اور باطل محض ہے، بدعت ضلالۃ تو وہ چیز ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف اور معارض ہو بلکہ بقول امام شافعی جو کتاب وسنت، اثر صحابی اور اجماع امت کے خلاف ہو، بحمد للہ اذان برقبر میں ایسی کوئی چیز نہیں،،

مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ فلاں محدث، فلاں امام، آئمہ وغیرہ کی قبور پر اذان نہیں ہوئی، مولف کو علم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں معاشرتی اور نجی زندگی، دنیا سے رحلت فرما جانے والے لوگوں کی زندگی کے تمام حالات اور واقعات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے ان کے نجی معاملات تک رسائی ناممکن، مشہور اور معروف ہونے کے باوجود یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے کارہائے حیات یہی ہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانبردار رہے ہیں ورنہ اتنا بلند مقام کا حصول ناممکن ہے،،، مولف کتابچہ نے کتابچہ کے

ص ،۲۱، پر جن حضرات کا ذکر کیا ہے ان کی رحلت کا وقت کیا ہے، غسل کس نے دیا؟ نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟ شرکاء کتنے تھے، اور کون کون تھے؟ ان نفوس قدسیہ نے کتنے حج کیے، زندگی بھر کتنی زکوۃ دی؟ کتنا صدقہ دیا اور جماعت کے ساتھ کتنی نمازیں ادا کیں؟ ان کے اوراد اور وظائف کیا تھے؟ مولف کتابچہ کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کے بل بوتے پر انہوں نے لکھ دیا کہ ان بزرگوں کی قبر پر اذان نہیں ہوئی،، تعجب ہے کہ جلیل القدر ہستیوں کو بھی مولف کتابچہ نے ایک عام گنہگار شخص کے ساتھ کھڑا کر دیا ہے، کیا مولف ان حضرات کے دفنانے کے وقت خود موجود تھے؟

مولف نے سوالیہ انداز میں لکھا کہ ان حضرات کو اہل سنت و جماعت سے مانتے ہو کہ نہیں؟ راقم کہتا ہے کہ یہ حضرات اہل سنت و جماعت کے جلیل القدر راہ نما ہیں، ان حضرات کا اہل سنت و جماعت سے ہونا نہ اذان دینے پر موقوف ہے اور نہ اذان کو بدعت ضلالۃ کہنے پر، فروعی مسائل میں اختلاف کرنا تاکہ حق کا حصول ہو رحمت ہے، عقائد اور دیگر اصولی مسائل مین اختلاف کرنا گمراہی اور بے دینی ہے جو آدمی کو اہل سنت و جماعت سے خارج کر دیتی ہے،،

مولف کتابچہ نے ص ،۴۸ پر لکھا ہے کہ تمام پرانی کتابوں مثلاً رکن الدین، مالا بد منہ، بہار شریعت ہنی بہشتی زیور، نماز کے مسائل مولفہ مولانا اوکاڑوی میں اذان علی القبر کا مسئلہ موجود نہیں،،

مولف کی معلومات مین اضافہ کیلئے تحریر ہے بہار شریعت میں اذان بر قبر کا ذکر موجود ہے، دیکھیے ص ،۱۷۱، مطبوعہ شبیر برادرز لاہور،،

ان کتب کا وجود اپنی جگہ، مولف کا ان کتابوں کا ذکر کرنا کتنا مضحکہ خیز ہے، ان کتب میں ردالمختار، درمختار وغیرہ کے درج کردہ فقہی مسائل تحریر کیے گئے ہیں، گویا یہ کتب فتاوی مشہورہ کے اقتباسات ہیں، تنویر الابصار، درمختار، ردالمختار فتاوی قاضی خان وغیرہ کے مقابل یہ کسی طور ترجیح کے قابل نہیں ہیں،

مولف کتابچہ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت و جماعت سے نہیں ہیں اگر ہوتے تو امام شافعی ، امام ابن حجر ، مام بدرالدین عینی ، ملا علی قاری ، امام نووی ، علامہ شامی ، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق در بار بدعت سے اعراض وانحراف نہ کرتے ، مولف نے جن کتب کا ذکر کیا ہے یہ تو کل گزشتہ کی پیداوار ہیں ، جبکہ تنویر الابصار ، درمختار ، ردالمختار ، بحرالرائق ، حاشیہ بحرالرائق صدیوں پرانی کتب اور فقہاء احناف کے مسلمہ فتاوی اور اہل سنت و جماعت کا سرمایہ حیات ہیں

،یہ بین تفاوت از کجا تا بہ کجا،،

مولف کتابچہ نے ص، ۲۵ پر لکھا کہ سعودی عرب میں اذان برقبر کا تصور نہیں ، وہاں حنفی کم ہیں حنبلی ،شافعی زیادہ ہیں ، شام اردن ، عرب امارات ، عراق فلسطین ، انڈونیشیا ، ملائشیا ، ترکی۔ لیبیا ، لبنان غرضیکہ تمام عالم اسلام مین اذان برقبر کا وجود نہیں ،

مولف کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان ممالک کا دورہ کر کے آخری فتوی یہ دیا ہے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ امر واقعہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک میں قرآن وسنت کے مطابق انسانی زندگی رواں دواں ہے کیا معاشی ، معاشرتی اور دینی معاملات میں کتاب وسنت کی حکمرانی ہے؟ کیا ان ممالک کے مسلمان فرائض پابندی سے ادا کرتے ہیں ؟ اگر ان کی زندگی قرآن وسنت کے سائے میں بسر ہورہی ہو تو پھر بھی ان کا طرز عمل دینی اور شرعی لحاظ سے حجت نہیں ، چہ جائیکہ ان کی عملی زندگی مخدوش اور قابل رحم ہو،

مزید یہ کہ علامہ ابن عابدین ملک شام کے رہنے والے ہیں ان کے زمانے میں اذان علی القبر کا وجود تھا جس کو علامہ نے اپنے فتاوی ردالمختار ، ۲ ، ۳ ، پر اس کا ذکر کیا ہے ، علامہ خیرالدین الرملی فلسطین کے رہنے والے ہیں ان کے دور میں بھی اذان برقبر متعارف تھی ، ہندو پاک مین آج بھی سنی العقیدہ لوگ بعد از دفن قبر پر اذان دیتے ہیں ، مولانا الشاہ احمد رضا خاں صاحب رحمہ اللہ نے اذان برقبر کی مشروعیت پر ایک رسالہ موسومہ ایذان الاجر تحریر فرمایا ہے ،، پاکستان میں بھی علماء

مولف کتابچہ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت و جماعت سے نہیں ہیں اگر ہوتے تو امام شافعی ، امام ابن حجر، مام بدرالدین عینی، ملا علی قاری ، امام نووی ، علامہ شامی ، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق دربار بدعت سے اعراض وانحراف نہ کرتے ،مولف نے جن کتب کا ذکر کیا ہے یہ تو کل گزشتہ کی پیداوار ہیں، جبکہ تنویر الابصار، درمختار، ردالمختار، بحر الرائق، حاشیہ بحر الرائق صدیوں پرانی کتب اور فقہاء احناف کے مسلمہ فتاوی اور اہل سنت و جماعت کا سرمایہ حیات ہیں ،یہ بین تفاوت از کجا تا بہ کجا،،

مولف کتابچہ نے ص، ۲۵ پر لکھا کہ سعودی عرب میں اذان بر قبر کا تصور نہیں، وہاں حنفی کم ہیں حنبلی ،شافعی زیادہ ہیں، شام اردن، عرب امارات، عراق فلسطین، انڈونیشیا، ملائشیا، ترکی ۔ لیبیا، لبنان غرضیکہ تمام عالم اسلام مین اذان بر قبر کا وجود نہیں،

مولف کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان ممالک کا دورہ کر کے آخری فتوی یہ دیا ہے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ امر واقعہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک میں قرآن وسنت کے مطابق انسانی زندگی رواں دواں ہے کیا معاشی ، معاشرتی اور دینی معاملات میں کتاب وسنت کی حکمرانی ہے؟ کیا ان ممالک کے مسلمان فرائض پابندی سے ادا کرتے ہیں؟ اگر ان کی زندگی قرآن وسنت کے سائے میں بسر ہورہی ہو تو پھر بھی ان کا طرز عمل دینی اور شرعی لحاظ سے حجت نہیں، چہ جائیکہ ان کی عملی زندگی مخدوش اور قابل رحم ہو،

مزید یہ کہ علامہ ابن عابدین ملک شام کے رہنے والے ہیں ان کے زمانے میں اذان علی القبر کا وجود تھا جس کو علامہ نے اپنے فتاوی ردالمختار، ۲، ۳، پر اس کا ذکر کیا ہے، علامہ خیرالدین الرملی فلسطین کے رہنے والے ہیں ان کے دور میں بھی اذان بر قبر متعارف تھی، ہندو پاک مین آج بھی سنی العقیدہ لوگ بعد از دفن قبر پر اذان دیتے ہیں، مولانا الشاہ احمد رضا خاں صاحب رحمہ اللہ نے اذان بر قبر کی مشروعیت پر ایک رسالہ موسومہ ایذان الاجر تحریر فرمایا ہے،، پاکستان میں بھی علماء

مولف کتابچہ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت و جماعت سے نہیں ہیں اگر ہوتے تو امام شافعی، امام ابن حجر، مام بدرالدین عینی، ملا علی قاری، امام نووی، علامہ شامی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق در بار بدعت سے اعراض وانحراف نہ کرتے، مولف نے جن کتب کا ذکر کیا ہے یہ تو کل گزشتہ کی پیداوار ہیں، جبکہ تنویر الابصار، درمختار، ردالمختار، بحرالرائق، حاشیہ بحرالرائق صدیوں پرانی کتب اور فقہاء احناف کے مسلمہ فتاوی اوراہل سنت و جماعت کا سرمایہ حیات ہیں ،یہ بین تفاوت از کجا تا بہ کجا،،

مولف کتابچہ نے ص، ۲۵ پر لکھا کہ سعودی عرب میں اذان برقبر کا تصور نہیں، وہاں حنفی کم ہیں حنبلی ،شافعی زیادہ ہیں، شام اردن، عرب امارات، عراق فلسطین، انڈونیشیا، ملائشیا، ترکی۔ لیبیا، لبنان غرضیکہ تمام عالم اسلام مین اذان برقبر کا وجود نہیں،

مولف کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان ممالک کا دورہ کر کے آخری فتوی یہ دیا ہے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ امر واقعہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان ممالک میں قرآن وسنت کے مطابق انسانی زندگی رواں دواں ہے کیا معاشی، معاشرتی اور دینی معاملات میں کتاب وسنت کی حکمرانی ہے؟ کیا ان ممالک کے مسلمان فرائض پابندی سے ادا کرتے ہیں؟ اگر ان کی زندگی قرآن وسنت کے سائے میں بسر ہو رہی ہو تو پھر بھی ان کا طرز عمل دینی اور شرعی لحاظ سے حجت نہیں، چہ جائیکہ ان کی عملی زندگی مخدوش اور قابل رحم ہو،

ے مزید یہ کہ علامہ ابن عابدین ملک شام کے رہنے والے ہیں ان کے زمانے میں اذان علی القبر کا وجود تھا جس کو علامہ نے اپنے فتاوی ردالمختار، ۲، ۳، پر اس کا ذکر کیا ہے، علامہ خیرالدین الرملی فلسطین کے رہنے والے ہیں ان کے دور میں بھی اذان برقبر متعارف تھی، ہندو پاک مین آج بھی سنی العقیدہ لوگ بعد از دفن قبر پر اذان دیتے ہیں، مولانا الشاہ احمد رضا خاں صاحب رحمہ اللہ نے اذان برقبر کی مشروعیت پر ایک رسالہ موسومہ ایذان الاجر تحریر فرمایا ہے،، پاکستان میں بھی علماء

نے اس مسئلہ پر رسائل اور فتاوی لکھے ہیں ،جن میں مولانا مفتی احمد یار خان صاحب کا نام سرفہرست ہے ،مزید مسائل کا وجود لوگوں کی عادات اور عرف پر نہیں بلکہ قانون شرعی کے تحت ہے ،کسی دینی مسئلہ پر لوگوں کا عمل نہ کرنا ،قابل اعتناء نہ سمجھنا الگ بات ہے ،عمل نہ کرنے سے مسئلہ کی اہمیت اور حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ،

امور مشروعہ کے ترک سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا وجود اور حکم ہی ختم ہو گیا ہے ،لوگوں کا ترک باعث ضرر ہے نہ موجب نفی ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت قرآن مجید کی ترغیب فرماتے ہوئے مختلف سورتوں کے فضائل اور فوائد بیان فرمائے ہیں ،مگر کتنے لوگ ہیں جو ان سب کی تلاوت کرتے اور ان کے فضائل اور فوائد سے بہرہ ور ہوتے ہیں ،اور کتنے لوگ ہیں جو فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں تلاوت قرآن کرتے ہیں ، پڑھنے اور نہ ہی پڑھنے والوں کے تناسب کو دیکھا جائے تو نہ پڑھنے والے اکثریت میں ہیں ،کیا کثرت کی بناء پر فضائل سورت اور فوائد کی نفی یا ان میں کمی آجائے گی ،قرآن حکیم نے بار بار ادائیگی نماز کا حکم فرمایا ہے ،بہت ہی کم لوگ پڑھتے ہیں ،نہ پڑھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے کیا اکثریت کا نہ پڑھنا فرضیت کو ختم کر دیگا ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح ،شام یا مختلف اوقات میں بے شمار دعائیں پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے ،تسبیح ،تکبیر ،تحمید اور بے شمار وظائف بھی ارشاد فرمائے ہیں ، کتنے لوگ ان دعاؤں اور اذکار کو پڑھتے اور بے پناہ فضائل اور فوائد حاصل کرتے ہیں ،کیا نہ پڑھنے سے فرمان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہمیت اور افادیت ختم ہو جائیگی ،ہرگز نہیں ،،

حرمین طیبین کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے وہ صرف فرض نماز ہی ادا کرتے ہیں ،سنن اور نوافل ادا نہیں کرتے ، وضو ضروری نہیں سمجھتے پانی قریب ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیتے ہیں ،اور نماز پڑھ لیتے ہیں ،فقہاء احناف بلکہ فقہ حنفی کے مطابق تیمم کیلئے شرط ہے کہ ایک میل کی حدود مین پانی ملنے کا امکان نہ ہو ،سعودی عرب کے بدو ایسے جاندار حیوان بھی کھاتے ہیں ،جن کا کھانا حرام ہے یا

کم از کم طبیعت انسانی ان سے نفرت کرتی ہے، کیا ان لوگوں کا یہ مکروہ کردار دوسرے لوگوں کیلئے حجت ہے کیا ان کے کھالینے سے حرمت یا کراہیت حلت میں بدل جاتی ہے، سعودی عرب بلکہ خانہ کعبہ کے اندر دیکھا گیا ہے کہ لوگ قرآن حکیم کا تکیہ بنا لیتے ہیں، اوپر سے گزر جاتے ہیں ،عرب لوگ اپنی بچیوں کی خرید وفروخت کا کام بھی کرتے ہیں، کیا دوسرے ممالک کیلئے یہ مکروہ دھندا لائق عمل اور قابل حجت ہے، سعودی حکومت نے عراق کے خلاف امریکہ سے مدد مانگی اور ان کو مقدس سرزمین پر ٹھہرایا یہ بھی حجت ہے، قرآن مجید نے ارشاد فرمایا: ''اذا حللتم فاصطادوا'' جب تم حج سے فارغ ہوجاؤ تو شکار کرو، آج مکہ مکرمہ، منیٰ،، زدلفہ، میدان عرفات تک شہر اور بستیاں آباد ہیں، کثرت سے آمدورفت پائی جاتی ہے،

شکار اور شکارگاہوں کا نام ونشان نہیں بلکہ پورے سعودیہ میں شکار کا مشغلہ ہی ختم ہوکر رہ گیا ہے ،کیا ان آبادیوں اور شکارگاہوں کے نہ ہونے سے حکم شکار ختم ہوگیا ہے، ہرگز نہیں یہ عوارضات اور مانعات اپنی جگہ مگر حکم قرآن حکیم بدستور اپنی جگہ موجود ہے اس طرح اگر کوئی ملک، قوم، یا مذہب اذان برقبر کا قائل نہیں تو اس کی مشروعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا،،

مولف نے کتابچہ کے ص، ۲۵، پر لکھا کہ صرف ہندو پاک کے ایک دو مولویوں کو اذان علی القبر کا علم ہے جو کہتے پھرتے ہیں کہ اہل سنت وجماعت نے حکم دیا ہے،

مولف کی یہ تحریر انتہائی اخلاقی پستی کی دلیل ہے، اس تحریر میں علمائے اہل سنت حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی اور حضرت مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی رحمہا اللہ پر طنز کیا گیا ہے، مولف نے غلط کہا ہم پہلے نقل کرچکے ہیں کہ یہ سلسلہ فقہاء متاخرین سے چلا آرہا ہے، کوئی نئی بات نہیں البتہ مولف کیلئے نئی بات ہے کیونکہ ان کے علم کی انتہاء اور دوڑ مالا بدمنہ تک ہے،،

مولف نے کتابچہ کے ص، ۲۸ پر لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فیصلہ دے دیا ہے اور واضح فرمادیا ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور اس سے بچنے کیلئے حکم صادر فرمایا بدعت کے موضوع پر پہلے

نے اس مسئلہ پر رسائل اور فتاوی لکھے ہیں، جن میں مولانا مفتی احمد یار خان صاحب کا نام سرفہرست ہے، مزید مسائل کا وجود لوگوں کی عادات اور عرف پر نہیں بلکہ قانون شرعی کے تحت ہے، کسی دینی مسئلہ پر لوگوں کا عمل نہ کرنا، قابل اعتناء نہ سمجھنا الگ بات ہے، عمل نہ کرنے سے مسئلہ کی اہمیت اور حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا،

امور مشروعہ کے ترک سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا وجود اور حکم ہی ختم ہو گیا ہے، لوگوں کا ترک باعث ضرر ہے نہ موجب نفی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت قرآن مجید کی ترغیب فرماتے ہوئے مختلف سورتوں کے فضائل اور فوائد بیان فرمائے ہیں، مگر کتنے لوگ ہیں جو ان سب کی تلاوت کرتے اور ان کے فضائل اور فوائد سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جو فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں تلاوت قرآن کرتے ہیں، پڑھنے اور نہ ہی پڑھنے والوں کے تناسب کو دیکھا جائے تو نہ پڑھنے والے اکثریت میں ہیں، کیا کثرت کی بناء پر فضائل سورت اور فوائد کی نفی یا ان میں کمی آجائے گی، قرآن حکیم نے بار بار ادائیگی نماز کا حکم فرمایا ہے، بہت ہی کم لوگ پڑھتے ہیں، نہ پڑھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے کیا اکثریت کا نہ پڑھنا فرضیت کو ختم کر دیگا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح، شام یا مختلف اوقات میں بے شمار دعائیں پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے ، تسبیح، تکبیر، تحمید اور بے شمار وظائف بھی ارشاد فرمائے ہیں، کتنے لوگ ان دعاؤں اور اذکار کو پڑھتے اور بے پناہ فضائل اور فوائد حاصل کرتے ہیں، کیا نہ پڑھنے سے فرمان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہمیت اور افادیت ختم ہو جائیگی، ہرگز نہیں،،

حرمین طیبین کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے وہ صرف فرض نماز ہی ادا کرتے ہیں، سنن اور نوافل ادا نہیں کرتے، وضو ضروری نہیں سمجھتے پانی قریب ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیتے ہیں، اور نماز پڑھ لیتے ہیں، فقہاء احناف بلکہ فقہ حنفی کے مطابق تیمم کیلئے شرط ہے کہ ایک میل کی حدود مین پانی ملنے کا امکان نہ ہو، سعودی عرب کے بدو ایسے جاندار حیوان بھی کھاتے ہیں، جن کا کھانا حرام ہے یا

کم از کم طبیعت انسانی ان سے نفرت کرتی ہے، کیا ان لوگوں کا یہ مکروہ کردار دوسرے لوگوں کیلئے حجت ہے کیا ان کے کھالینے سے حرمت یا کراہیت حلت میں بدل جاتی ہے، سعودی عرب بلکہ کانہ کعبہ کے اندر دیکھا گیا ہے کہ لوگ قرآن حکیم کا تکیہ بنا لیتے ہیں، اوپر سے گزر جاتے ہیں ،عرب لوگ اپنی بچیوں کی خرید وفروخت کا کام بھی کرتے ہیں، کیا دوسرے ممالک کیلئے یہ مکروہ دھندا لائق عمل اور قابل حجت ہے، سعودی حکومت نے عراق کے خلاف امریکہ سے مدد مانگی اور ان کو مقدس سرزمین پر ٹھہرایا یہ بھی حجت ہے، قرآن مجید نے ارشاد فرمایا: ''اذا حللتم فاصطادوا'' جب تم حج سے فارغ ہوجاؤ تو شکار کرو، آج مکہ مکرمہ، منی،، زدلفہ، میدان عرفات تک شہر اور بستیاں آباد ہیں، کثرت سے آمد ورفت پائی جاتی ہے،

شکار اور شکار گاہوں کا نام ونشان نہیں بلکہ پورے سعودیہ میں شکار کا مشغلہ ہی ختم ہوکر رہ گیا ہے ،کیا ان آبادیوں اور شکار گاہوں کے نہ ہونے سے حکم شکار ختم ہوگیا ہے، ہرگز نہیں یہ عوارضات اور مانعات اپنی جگہ مگر حکم قرآن حکیم بدستور اپنی جگہ موجود ہے اس طرح اگر کوئی ملک ،قوم، یا مذہب اذان برقبر کا قائل نہیں تو اس کی مشروعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا،،

مولف نے کتابچہ کے ص، ۲۵، پر لکھا کہ صرف ہندو پاک کے ایک دو مولویوں کو اذان علی القبر کا علم ہے جو کہتے پھرتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت نے حکم دیا ہے،

مولف کی یہ تحریر انتہائی اخلاقی پستی کی دلیل ہے، اس تحریر میں علمائے اہل سنت حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی اور حضرت مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی رحمہا اللہ پر طنز کیا گیا ہے، مولف نے غلط کہا ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ یہ سلسلہ فقہاء متاخرین سے چلا آرہا ہے، کوئی نئی بات نہیں البتہ مولف کیلئے نئی بات ہے کیونکہ ان کے علم کی انتہاء اور دوڑ مالابد منہ تک ہے،،

مولف نے کتابچہ کے ص، ۲۸ پر لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فیصلہ دے دیا ہے اور واضح فرمادیا ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور اس سے بچنے کیلئے حکم صادر فرمایا بدعت کے موضوع پر پہلے

تبیان المسائل

دس اہم مسائل



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

مجلس علماء اہلسنت
وادی بناہ کھوئی رٹہ آزاد کشمیر

تفصیلاً بات ہو چکی ہے جس بدعت سے بچنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے وہ بدعت سیء ہے اور اس کی تائید میں جلیل القدر محدثین اور فقہاء کے اقوال بھی پیش کیے جا چکے ہیں، سب کا ذکر کرنا تکرار ہے جو بے مقصد ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ پیدا کردہ غلط بیانی اور خود ان کی غلط فہمی دور ہو جائے ،فرمایا: ما احدث مما یخالف الکتاب او السنۃ او الاثر، او الاجماع فھو ضلالۃ" (مرقات)

وہ نئی چیز جو کتاب، یا سنت یا اثر صحابی یا اجماع امت کے مخالف ہو وہ بدعت ضلالۃ ہے،

قارئین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہر نئی چیز بدعت ضلالۃ نہیں جیسا کہ مولف نے سمجھا اور لکھ دیا ہے بلکہ وہ نئی چیز بدعت ضلالۃ ہے جو قرآن، حدیث، صحابی کے عمل یا اجماع امت کے خلاف ہو، امام شافعی مجتہد فی الشرع ہیں،

حدیث کا معنی اور مفہوم ان سے زیادہ کون جان سکتا ہے، مولف کتابچہ خود بتائیں کہ فہم حدیث میں ان کا علم زیادہ ہے یا امام شافعی کا؟ مولف کتابچہ نے سنت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہوا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند کیا ہو، یہ تعریف غلط ہے خود ساختہ ہے ،علامہ ابن عابدین شامی نے سنت کی تعریف میں فرمایا کہ: "وبلا منع الترک ان کان مما واظب علیہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسلم او الخلفاء الراشدون من بعدہ فسنۃ والا فمندوب ونفل؟" (ردالمختار، ج ا، ص، ۱۰۲)

اگر امر کا چھوڑ دینا منع نہ ہو تو پھر دیکھا جائیگا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے خلفائے راشدین نے ہمیشہ اس عمل کو کیا ہے تو وہ سنت ہے اور اگر ہمیشہ نہیں کیا تو پھر وہ مستحب اور نفل ہے،،

ثابت ہوا کہ سنت وہ عمل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء راشدین نے ہمیشہ کیا ہے ،معلوم ہوا سنت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل متواتر کا نام نہیں اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند کا نام ہے بلکہ خلفائے راشدین کا اس پر عمل دوام کا پایا جانا

بھی لازمی اور ضروری ہے، یہی وجہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو، مولف نے تو حدیث کی بھی پوری تعریف نہیں کی، علامہ شبید احمد عثمانی دیوبندی فرماتے ہیں: "الحدیث اقوال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و افعاله ویدخل فی افعاله تقریره" (فتح الملہم)

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال، اقوال اور تقریر کا نام ہے،

مولف کو سنت اور حدیث کا فرق معلوم نہیں؟ ان کے درمیان پائی جانے والی نسبت کا علم نہیں؟ یقیناً معلوم نہیں، مقام غور ہے اگر اجزائے سنت میں پسند بھی داخل ہو تو سنت موکدہ اور سنت غیر موکدہ میں فرق کیا ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرات، رکوع، سجود میں طوالت بہت پسند تھی بدوں شک وشبہ یہ طوالت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی مگر سنت کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، کیونکہ کبھی کبھار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو ترک بھی فرمایا کرتے تھے، فقہائے کرام ے ان امور کی طوالت اور پسند کو عادت کہا ہے اور یہ سنت غیر موکدہ ہے، علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا کہ فقہاء نے سنت غیر موکدہ کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ: "وقد مثلوا سنة الزوائد ایضا بتطویلة علیه الصلوة والسلام القراة والرکوع ولسجود ولا شک فی کونه عبادة وحینئذ فمعنی کون سنة الزوائد عادة ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واظب علیها حتی صارت عادة له ولم یترکها الا احیاناً"

جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لمبی قرات کرنا لمبا رکوع اور سجود کرنا، ان امور کے عبادت ہونے میں کوئی شک نہیں، اب سنت غیر موکدہ کا معنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ عادت مبارکہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر ہمیشگی فرمائی ہو اور بعض اوقات اس کو چھوڑ بھی دیا ہو، علامہ شامی کی اس تصریح سے ثابت ہوا کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل دوام کا نام ہے پسند اور ناپسند کا اس میں کوئی دخل نہیں،

پھر فرمایا: "لان السنة فی الطریقة المسلوکة الدین" (ردالمختار، ص، ۱۰۳)

کیونکہ سنت موکدہ اس طریقے کا نام ہے جو دین میں جاری اور ساری ہے یعنی اس میں انقطاع نہیں بلکہ تسلسل ہے،،

واضح بات ہے کہ جس شخص کو سنت موکدہ، اور سنت غیر موکدہ کا فرق اور ان کی تعریف معلوم نہیں، وہ امر فقہی اور مقام فقہاء کو کیا پہچان سکتا ہے؟

مولف نے اذان برقبر کے بدعت ضلالۃ ہونے پر آیہء مقدسہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور آیہء مبارکہ: "وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا" بھی بطور دلیل پیش فرمایا ہے، واضح ہو کہ ان آیات کو اذان برقبر کی نفی اور بدعت ضلالۃ پر پیش کرنا کج فہمی اور جہالت ہے، کیونکہ دیکھنا یہ ہے بعداز دفن میت کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یعنی اسوہ حسنہ کیا ہے کہ بعداز دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو کیا دیا ہے؟ اور کس چیز سے روکا ہے؟ آیا بعداز دفن قبر پر خاموش کھڑے رہنا اسوہ حسنہ اور عطاء ہے یا میت کیلئے دعا استغفار کرنا اسوہ حسنہ ہے، خاموشی کسی قول یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی فعل سے ثابت نہیں بلکہ ثابت قدمی کیلئے دعا مانگنا ،دعا کا حکم دینا، استغفار کرنا ثابت ہے اور یہی اسوہ حسنہ ہے، اذان، ذکر استغفار ہے اس کا ادا کرنا اسوہ حسنہ ہے، منع کرنا اسوہ حسنہ نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اذان کے مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی ہے، جب خاموشی اسوہ حسنہ ہے تو اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہنا غلط ہے ،بدعت ضلالۃ کا ثبوت خاموشی پر معلق نہیں، بلکہ اس کیلئے نص کا ہونا ضروری ہے، قول صحابی ،اجماع امت کا ہونا لازمی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا نہ حکم دیا تو، مااتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ" کی خلاف ورزی کیسے لازم آتی ہے؟ حقیقتاً دونوں آیات خود مولف کے موقف کی نفی کرتی ہیں، مولف نے ان آیات سے آخر کیا ثابت کیا ہے پھر یہ کہ اتی نھی فعلہائے ماضی ہیں، جو لفظی اور معنوی اعتبار سے فعل کے محقق اور موجود خارجی ہونے کا تقاضا

کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فعل کا ثابت اور موجود فی الخارج ہونا ضروری ہے، آیت کو مبنائے استدلال بتانے کے بعد مولف پر لازم ہے کہ بصیغہء نہی یا امر اذان بر قبر کے ضلالۃ ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فرمان پیش کریں ما دونوں جگہ موصولہ مفید اہمال ہے، کسی چیز کے تعین اور تخصیص پر دلالت نہیں کرتا، کسی فرد کے اختصاص کیلئے قرینہ لفظی یا معنوی کا ہونا ضروری ہے، کسی فرد کو ممتاز کرنے کیلئے آیہء مقدسہ میں کوئی قرینہ نہیں، کس لحاظ سے اذان بر قبر کو ما اتاکم الایہ کا فرد بنایا جا سکتا ہے؟ حجۃ الوداع کے موقع پر اگر دین اپنے کلیات اور جزئیات کے اعتبار سے مکمل ہو چکا اور تمام تفصیلات آ چکی تھیں تو سوال یہ ہے کہ اجتہاد ، قیاس، اور اجماع امت کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ یہ ادلہ شرعیہ ہیں، یہ ادلہ ما اتاکم الرسول الایہ کے تحت داخل اور اس کا فرد ہیں یا نہیں اگر داخل ہیں تو درست مگر ان کا وجود اور ثبوت دور رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دور صحابہ کرام میں نہیں؟ اگر داخل نہیں تو ان کو دلیل شرعی ہونے کا درجہ کیسے حاصل ہو گیا؟ حدیث گزشتہ کل بدعۃ ضلالۃ سے اذان بر قبر کو بدعت ضلالہ کہا گیا ہے، پوچھنا چاہونگا کہ حدیث مبارک میں بدعت کی تعریف ہے یا حکم؟

بدعت سے مراد ماہیت بدعت ہے یا افراد بدعت، اگر افراد ہوں تو حکم اپنے ماحول کے اعتبار سے الایجاب الکلی ہے یا الایجاب الجزی؟ اگر ایجاب الکلی ہو تو حضرت عمر کا فرمان نعمت البدعۃ ھذہ، اس میں داخل اور اس کا فرد ہوگا، نعمت البدعۃ ھذا کا کل بدعت ضلالۃ کا فرد ہونا عقلاً اور نقلاً باطل ہے، عقلاً اس لئے کہ یہ امر غیر مسلم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا جلیل القدر صحابی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجدد الامت کا لقب اور خطاب عطاء فرمایا ہے وہ بدعت ضلالۃ کو کار حسن کہیں نقلاً اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے مار اہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن "من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ الحدیث" فرمان عمر کا بدعۃ ضلالۃ کا فرد ہونا غیر مسلم اور غلط ہے، جب فرمان عمر حدیث مبارکہ میں فرد کے طور پر داخل نہیں تو ماننا پڑیگا کہ

بدعت کا ایک فرد ایسا بھی ہے جو ضلالۃ نہیں بلکہ امر حسن ہے، اس طرح اذان برقبر کو حدیث مبارکہ کے عموم میں داخل اور شامل کرنا بھی غلط ہے، ہمارے موقف کی دلیل یہ ہے کہ نماز کے علاوہ جن مقامات پر فقہاء کرام نے اذان دینے کو سنت کہا ہے ان میں ایک اذان برقبر بھی ہے لیکن اذان کو بدعت ضلالۃ کہنے والوں کے پاس کیا دلیل ہے؟ کل بدعۃ ضلالۃ کا عموم تو ٹوٹ چکا ہے علمائے محققین کا اصول یہ ہے کہ پہلے شے کی تعریف کی جاتی ہے اس کی ماہیت بیان کی جاتی ہے پھر اقسام اور پھر حکم صادر کیا جاتا ہے مولف نے بدوں تعریف بدعت، بدوں تحقیق حدیث مبارکہ سے حکم بیان کردیا ہے اور وہ بھی من مانی تعبیرات کی صورت میں،

مولف کتابچہ نے تحریر کیا کہ لیجیے قاضی صاحب، امام اہل سنت ملا علی قاری کو بھی اپنے قلم کے زور پر اہل سنت سے نکال باہر پھینک دیجیے، یہاں سے بھی اذان برقبر ثابت نہ ہوسکی، (ص ۳۲)

ملا علی قاری اہل سنت و جماعت کے امام اور حنفیوں کی پہچان ہیں، ہم ان کے نام لیوا اور ان کے علم بیکراں کے گدا ہیں، خود ملا علی قاری اور امام طیبی نے فرمایا کہ حدیث لقنوا موتاکم میں لفظ موتی مجازی معنی میں مستعمل ہے اور وہ قریب المرگ شخص ہے، موتی کا حقیقی معنی مردہ یعنی مرا ہوا شخص ہے، علامہ ابن عابدین الشامی نے امام طیبی اور ملا علی قاری کے بیان کردہ معنی کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ: "اما اھل السنۃ فالحدیث لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ محمول علی حقیقۃ لان اللہ تعالی یحییہ علی ماجاءت بہ الاثار" (درالمختار، ج، ۲، ۱۹۱)

حدیث لقنوا موتاکم اہل سنت کے نزدیک حقیقی معنی پر محمول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ میت کو زندہ کرتا ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے،

مولف کتابچہ نے ملا قاری اور امام طیبی کے قول کو نہیں سمجھا، علامہ ابن عابدین الشامی نے تو واضح فرمایا کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ حدیث اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے یعنی موتی اپنے حقیقی پر ہے اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ بعد از دفن تلقین کرو، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر میں مردہ کو زندہ فرماتا ہے، تلقین کن الفاظ سے کرو، کلمہ توحید سے یعنی لا اله الا اللہ محمد رسول اللہ کہو، اسی حدیث پر ملا علی قاری نے فرمایا کہ:"ای ذکر وامن حضره الموت منکم بکلمة التوحید بکلمة الشهادة بان تتلفظو بها عنده ، لا ان تامروه بها قال الطیبی ای من قرب منکم الموت سماء باعتبار مایاول الیه مجازا" (مرقات، ص، ۱۲)

کہ جو شخص قریب المرگ ہو تو اس کو کلمہ توحید یا کلمہ شہادت کی تلقین کرو، یعنی اس کے نزدیک اس کے پاس ہر دو کلمات میں سے کسی ایک کلمہ کا تلفظ کرو، زبان سے ادا کرو، امام طیبی نے فرمایا کہ قریب المرگ شخص کو میت، مردہ مجازی طور پر کہا ہے، یہاں معنی مجازی کیوں لیا گیا ہے اس لئے کہ اس کا انجام اور مآل موت ہے،

علامہ شامی نے تلقین بعد از دفن کو اہل سنت وجماعت کا مسلک بیان فرمایا ہے، سنی العقیدہ علماء کا مسلک یہ ہے کہ بعد از دفن قبر پر کھڑے ہو کر اس کو کلمہ توحید کی تلقین کی جائے، ملا علی قاری نے فرمایا کہ تلقین کیلئے کلمہ توحید کا تلفظ ہی ضروری نہیں بلکہ کلمہ شہادت بھی پڑھا جا سکتا ہے، ثابت ہوا کسی کلمہ کی تخصیص نہیں فرمائی گئی، اذان علی القبر میں کلمہ توحید بھی ہے اور کلمہ شہادت بھی اذان دینے سے حدیث لقنوا موتاکم الحدیث کی پوری پوری علمداری ہے،،

مولف کتابچہ نے کہا کہ تلقین کے الفاظ اس طرح کے ہیں، اے فلاں بن فلاں تو اس دین کو یاد کر جس پر تو دنیا میں تھا، یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں، حدیث مذکورہ بالا بھی وارد ہوئی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ تلقین کے الفاظ فلاں بن فلاں ہی نہیں جس طرح مولف کتابچہ نے سمجھا ہے، بلکہ کلمہ توحید، کلمہ شہادت بھی تلقین ہی ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے فرمایا ہے، ملا علی قاری مزید فرماتے ہیں کہ:و کذا التلقین یمکن حمله علی مابعد الدفن، فان اطلاق التلقین علیه احق من المحتضر لا یخلو من المجاز بخلاف بعد الدفن" (مرقات، ج، ۴، ص ۱۲)

لقنوا موتاكم لا الہ الا اللہ سے مراد تلقین بعد از دفن بھی ہو سکتی ہے کیونکہ تلقین کا اطلاق میت کیلئے مرنے والے کی نسبت زیادہ صحیح ہے، اس لئے کہ جو شخص قریب المرگ ہے اس کو مجازی طور پر مردہ کہا گیا ہے اور جو قبر میں رکھا ہوا ہے اس کیلئے میت کا اطلاق حقیقی معنی میں ہے،،

اس توضیح سے بھی ثابت ہوا کہ تلقین قریب المرگ شخص کی نسبت مرے ہوئے شخص کیلئے زیادہ موزوں ہے اور وہ زیادہ حق دار ہے، مولف کتابچہ نے ملا علی قاری کی نسبت تحریر کیا کہ وہ امام اہل سنت ہیں بلاشبہ امام اہل سنت اور امام حنفیہ ہیں، امام اہل سنت فرمار ہے ہیں کہ تلقین کا زیادہ حقدار قبر میں پڑا ہوا شخص ہے اور وہی اس کا معنی حقیقی ہے اور تلقین میں کلمہ توحید ہو یا کلمہ شہادت تلقین ہی ہے، مولف کتابچہ بتائیں کہ وہ زیادہ جانتے ہیں یا امام اہل سنت؟ ان کا کہنا صحیح یا امام اہل سنت کا فرمان؟ تعجب ہے ایسے ذہن، علم، اور عقیدہ پر جس کا مسلک یہ ہو کہ کلمہ توحید، قبر میں میت کو فائدہ دے سکتا ہے، مگر اذان جو کلمہ توحید، کلمہ شہادت، اور تکبیر پر مشتمل ہے، تمام اعتقادی مسائل کا مجموعہ ہے، اللہ کا ذکر، دین اسلام کی علامت ہے، جب یہ شخص دنیا میں آیا تھا تو یہی اذان اس کیلئے فائدہ مند تھی، مگر آج فائدہ مند نہ ہے، محقق ابن الہمام نے کس قدر ایمان افروز ارشاد فرمایا ہے کہ اذان اللہ کا ذکر ہے اللہ کے بندوں، اللہ کے دین کی خاطر، اللہ کی زمین پر یاد دہانی کے طور پر نشر کی جاتی ہیں، اگر اذان تکبیر، کلمہ توحید، کلمہ شہادت، ذکر الٰہی ہو کر میت کو فائدہ نہیں دے رہی تو اور کیا فائدہ دے گا؟ پھر اگر فلاں بن فلاں تو اس دین کو یاد کر جس دین میں تو تھا کے سادہ اور عام الفاظ میت کیلئے مفید ہیں تو یہ مقدس الفاظ جو فرشتوں، رسول اللہ، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، بلکہ پوری امت کے منہ سے نکلے اور قیامت تک نکلتے رہیں گے کوئی تاثیر نہیں رکھتے؟ اگر شعلے بھڑکاتی آگ بجھ سکتی ہے لشکر فتح یاب ہو سکتے ہیں انسان اور جن کی سرکشی ختم ہو سکتی ہے، مرگی کا دورہ کافور ہو سکتا ہے، غم اور اندوہ دور ہو سکتے ہیں، ان دیکھی مخلوق کی راہ نمائی ہو سکتی ہے، راستہ بھولنے والے کی راہبری ہو سکتی ہے تو میت کو قبر مین فائدہ نہیں ہو سکتا

حیرت کا مقام ہے؟‘‘

خلاصہ یہ ہے کہ ملا علی قاری، علامہ ابن عابدین الشامی، امام طیبی کے نزدیک لقنوا موتاکم میں تلقین بعداز دفن زیادہ صحیح اور حقیقی معنوں میں ہے، اور مردہ قبر میں اس کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے مولف نے کتابچہ کے ص، ۴۰، پر لکھا کہ ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کے الفاظ نماز مین کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت توحید، ردکفر میں موجود ہیں اور خود قرآن پاک میں بھی کئی جگہ موجود ہیں تو پتہ چلا کہ ’’لا الہ الا اللہ ‘‘ سے مراد اذان نہیں بلکہ ذکر ہے،

مولف نے بغیر تفہیم حدیث اور بدوں تفکر لقنوا موتاکم ’’لا الہ الا اللہ‘‘ میں ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کو ذکر کہاہے، ’’لا الہ الا اللہ‘‘ ذکر ہے کوئی شک نہیں، بلکہ یہ افضل الذکر ہے، لیکن قریب المرگ شخص کے پاس ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کا پڑھنا بطور ذکر نہیں بلکہ بطور تلقین اور تذکر ہے، یعنی میت کو ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کے پڑھنے کی طرف راغب کرنا اور اس کو یاددلانا ہے تا کہ وہ سن کر خود بھی پڑھے اور اسکا خاتمہ بالخیر ہو، اگر ذکر ہی ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کیوں ارشاد فرماتے کہ قریب المرگ شخص کو ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کی یاددہانی کراؤ، اس کے پاس پڑھو تا کہ وہ سن کر خود بھی پڑھے، اگر ذکر مراد ہوتا تو ارشاد فرمایا جاتا کہ تم کثرت سے قریب المرگ آدمی کے پاس ذکر کرو، بلکہ لقنوا کے الفاظ اور باب تفعیل کا استعمال ہونا اور اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ’’لا الہ الا اللہ‘‘ پڑھنے کا مقصد قریب المرگ شخص کو کلمہ طیبہ پڑھنے کی ترغیب دلانا ہے یہ مقصد نہیں کہ وہ حاضرین کے ساتھ مل کر ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کا ورد کرے اور اس تلقین اور تذکیر کا مقصد اس کا انجام بخیر بنانا ہے فقط حصول ثواب نہیں، پڑھنے والوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ قریب المرگ کو ’’لا الہ الا اللہ‘‘ پڑھنے کا حکم نہ دیں بلکہ صرف اس کے سامنے پڑھیں تا کہ ان کی آواز کو سن کر اور ان کو دیکھ کر وہ بھی پڑھے، اگر ’’لا الہ الا اللہ‘‘ سے مراد ذکر ہے تو معنی یہ ہوگا کہ قریب المرگ شخص کو ذکر کرنیکی تلقین کرو، یہ معنی قطعی غلط ہے کیونکہ اس کو ذکر کیلیئے کہنے کی ممانعت کی گئی ہے، بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ’’لا الہ الا اللہ‘‘

سے مراد ذکر ہے تو بتایئے لقنوا فعل امر ہے موتاکم مفعول اول ''لا الہ الا اللہ'' مفرد بتحویلِ مفعول ثانی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ میت پر تلقین ''لا الہ الا اللہ'' یعنی ذکر کرو، کیا قریب المرگ شخص ذکر کرنے کا اہل ہے، کیا حدیث کا یہ مقصد ہے تم خود ذکر کرو، اگر مقصد یہ ہے تو موتاکم کے ذکر کرنے کا مقصد؟ تسلیم کرنے پڑے گا کہ لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ میں لقنوا فعل امر ہے موتاکم مفعول لہ ہے اور ''لا الہ الا اللہ'' کا جملہ اسمیہ تحویل مفرد میں مفعول بہ ہے، حدیث کا معنی یہ ہے کہ تم میت کیلیئے ''لا الہ الا اللہ'' کا فعل معرض وجود میں لاؤ، حدیث کا مقصد اور غرض وغایت، اس کے انجام کو بخیر بنانا ہے کیونکہ نجات کا دارومدار اقرار توحید اور رسالت پر ہے، لہٰذا امر ہر دو امور کی طرف اس کی توجہ مبذول کرانے کیلیئے ہے اسی لئے میت کے پاس لا الہ الا اللہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، تلقین کا مقصد ذکر نہیں بلکہ تذکرہ ہے، جس کا نام یاددہانی ہے مولف نے کتابچہ کے ص ۲۸، پر اذان بر قبر کے بدعت ضلالۃ ہونے پر علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین نقل کی ہے، حدیث کا سیاق وسباق کیا ہے وہ یہ کہ اس حدیث میں امارۃ اور خلافت کا تذکرہ ہے، پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اوصیکم بتقوی اللہ و اسمع و الطاعة و ان کان حبشیا، فانه من یعش منکم بعدی سیری اختلافا کثیرا۔ فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین ،الحدیث''

میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، اگرچہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے کی وصیت کرتا ہوں، تم میں سے میرے بعد زندہ رہ جانے والا بہت سے اختلافات دیکھے گا، ایسی صورت میں تم پر میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام رکھنا لازم اور واجب ہے،

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ اور خلفائے راشدین کی سنت کا اتباع اور التزام لازمی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سنتی سے کیا مراد ہے؟ مطلق سنت یا سنت مخصوصہ، اگر مطلق سنت ہو تو لازم

آیئگا کہ سنت غیر موکدہ جو نفل اور مستحب کے حکم میں ہے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہو کیونکہ علیکم اسم فعل ہے اور بمعنی امر اور وجوب کیلیئے ہے، اسم فعل، فعل امر کی ایک ثانوی صورت ہے فعل امر جس طرح وجوب کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح اوقات استحباب کا حکم بھی رکھتا ہے، تو گویا علیکم میں دونوں احتمالات ہیں، (۱) وجوب (۲) استحباب، وجوب پر جو سقم آتا ہے اس کا بیان ہو چکا ہے اگر علیکم بمعنے استحباب کے ہو تو اس کیلیئے علیکم سے لزوم عمل کی پابندی اس کے معنی پر زیادتی ہے جو لغوی طور پر غلط ہے اور سنتی میں سنت سے مراد سنت مخصوصہ ہو تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں، (۱) یعنی ادائیگی اور حکم کے لحاظ سے خاص ہو، وہ سنت موکدہ ہے، اذان بر قبر کا معاملہ سنت غیر موکدہ کا ہے وہ اس میں داخل نہیں، (۲) سنت سے مراد وہ سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ ہے جیسے لمبی نماز پڑھنا، لگاتار روزے رکھنا، یہ امت کیلیئے واجب نہیں تو پھر علیکم بسنتی فرمانا کیسے درست ہے؟ اس پر مستزاد یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلفائے راشدین کی سنت کو بھی سختی سے تھام رکھنے کا حکم فرمایا ہے، خلافت راشدہ کا زمانہ تیس سالوں پر مشتمل ہے، خلفائے راشدین کی زندگی دو طرح کی ہے

(۱) نجی (۲) معاشرتی

نجی زندگی کے کچھ گوشے امت مسلمہ کے سامنے ہیں زیادہ تر پوشیدہ اور غیر واضح ہیں، معاشرتی زندگی میں ان کے ادوار خلافت بھی ہیں، دور خلافت کے اہم واقعات اور اہم معاملات تاریخ نے بیان کیے ہیں، پھر دور خلافت کے واقعات اور ان کے طریقے خاصہ خلافت ہیں، ان کی لازمی اتباع کا حکم دینا تکلیف، مالا یطاق ہے اور دوسرے معنی میں ایسے طریقوں کے اپنانے کا حکم بھی دیا گیا ہے جو غیر متعلقہ یا مخفی ہیں، لہٰذا حدیث مبارکہ پر عمل کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟ تدبر و تفکر، اگر مقصد یہ کہ خلفائے راشدین کی سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت کی تبلیغ اور صیغہ عمل سے متعلق ہے تو پھر بھی بتایئے اذان بر قبر پر خلفائے راشدین کی سنت کیا ہے؟ خاموشی ہے نہ دینے کا حکم دیا اور نہ دی اور نہ ہی منع فرمایا، تو منع کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ہم کس دلیل

سے منع کرتے ہیں، اس حدیث سے تو اذان برقبر کی اباحت ثابت ہوئی نہ کہ ممانعت، جوامر مباح ہو اگر عبادت کی نیت سے کیا جائے ثواب ملتا ہے،

جبکہ ملا علی قاری نے فرمایا کہ: المباحات فانها لا تفید المثوبات الا اذنوی بها فاعلها القربات" (مرقات، ج،۱،ص، ۴۴)

جو امور مباح ہیں ان کے کرنے سے ثواب اسی وقت ملے گا جب کرنے والا ان کو عبادت کی نیت سے کرے،،

ثابت ہوا مباح کو عبادت سمجھ کر اس کو کرنا باعث ثواب ہے، مولف نے اذان برقبر کی ممانعت پر اس حدیث کو نقل کیا ہے، مگر یہ حدیث خود مولف کے موقف کو رد کرتی ہے اور ہمارے موقف کی تائید کرتی ہے کہ کم از کم اذان برقبر امر مباح ہے عبادت کی نیت سے دی جائے تو موجب ثواب ہے،

مولف نے یہ بھی کہا کہ لا الہ الا اللہ کی تلقین اگر دلیل اذان ہے تو یہی لا الہ الا اللہ دیگر پانچ کلموں میں بھی پایا جاتا ہے، اور بھی کئی جگہ آتا ہے پھر ان کو پڑھنا چاہیے مولف نے حدیث لقنوا اموتاکم لا الہ الا اللہ کا مفہوم نہیں سمجھا، یہ حدیث مبارک ایک نص ہے اس کے الفاظ بدوں اشتراک غیرے مختص اور اس کا محل بھی مخصوص ہے، لہٰذا اس حدیث کو مورد شرع پر ہی رکھا جائیگا، یعنی اس سے مراد فقط یہی الفاظ بطور علم کے ذکر فرمائے گئے ہیں، کیونکہ اسلام کے ارکان میں کلمہ توحید پہلا رکن ہے اس توحیدی کلمہ کو میت کی زبان سے ادا کروانا مقصود ہے، بقول ملا علی قاری دوسرا کلمہ شہادت بھی پڑھا جاتا ہے، ابتدائی دو کلمات میں انفرادی طور پر توحید اور رسالت کا ذکر ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان دو کلمات سے میت کو تذکیر کرنے کا حکم فرمایا ہے، اذان کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ الفاظ تذکیر بھی اس میں موجود ہیں، اور اللہ اکبر کے کلمات بھی ہیں جو میت کیلئے آسانی اور سہولت پیدا کرنے میں تیر بہ ہدف ہیں، ان کا ورد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سے ثابت ہے، نیز فقہاء امت نے میت کی سہولت کیلئے قبر پر اذان دینے کا حکم دیا ہے

اس لئے اذان کو مختص کیا گیا ہے، نیز جن کلمات کا مولف نے ذکر کیا ہے ان کی فضیلت احادیث سے ثابت نہیں، جبکہ اذان کے بلند پایہ فضائل اور برکات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں اس لئے فقہاء نے اذان دینے کو ترجیح دی ہے،،

بعد از دفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبر پر سبحان اللہ پڑھا اللہ اکبر کا ورد کیا، پھر یہ فرمایا کہ میت کو کہو" اذکر دینک الذی کنت فیه" الحدیث اور یہ بھی فرمایا" واسئلوا له التثبت فانه الان یسئل " الحدیث ، یہ معمولات اور ارشادات اس امر کی دلیل ہیں کہ تلقین الا اله الا اللہ یا اشهد ان الا الہ الا اللہ ہی نہیں بلکہ سبحان اللہ، اللہ اکبر، اذکر دینک الذین اور دعائے ثبات سب کے سب بذمرہ تلقین شامل اور داخل ہیں، ملا علی قاری، علامہ ابن عابدین الشامی کے فرمودات پہلے گزر چکے ہیں، مولف نے لکھا کہ امام مسلم کی صحیح سے لکر ابن ماجہ کی سنن تک تمام محدثین نے اس حدیث کو ذکر کرکے اس کا معنی قریب المرگ کو لا الہ الا اللہ سکھلانا مراد لیا ہے،،

اس کی دلیل کیا ہے کوئی قول، کوئی تفسیر نقل نہیں کہ لہٰذا نا قابل تسلیم ہے، ہم نے بحوالہ ثابت کیا ہے کہ محدثین اور فقہاء نے تلقین بعد از دفن کو زیادہ اہمیت دی ہے، سوچنے کی بات یہ ہے اگر اے فلاں کے بیٹے فلاں کو اس دین کو یاد کر جس دین میں تو تھا، کے الفاظ میت کو قبر میں فائدہ دے سکتے ہیں تو کیا اذان کے کلمات طیبات میت کو فائدہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے، پہلے الفاظ نہ کلمہ توحید ہیں نہ کلمہ شہادت، نہ تکبیر، اگر وہ سادہ الفاظ میت کی طمانیت اور راہنمائی کیلئے تیر بہ ہدف ہیں تو کیا اذان جو ان تمام کلمات کی جامع ہے قبر پر دینا بدعت ضلالۃ ہے؟ وہ میت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی؟ جوہرہ نیرہ میں ہے کہ دفن کے بعد مردہ کو تلقین کرنا اہل سنت کے نزدیک امر مشروع ہے،،

مولف نے کتابچہ کے ص، ۱۴۱ پر تحریر کیا کہ علامہ شامی کے نزدیک اذان بعد از دفن سنت نہیں بلکہ میت کو قبر میں اتارتے وقت سنت قرار دیا ہے،،

یہ عبارت بھی مولف ،معترض کو کوئی فائدہ نہیں دے رہی کیونکہ اس سے مراد بعد از دفن ہی ہے ،بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ میت کو قبر میں اتارتے وقت علامہ شامی نے مقید کی ہے پھر بھی ہمارے موقف کے مخالف نہیں بلکہ مولف معترض کیلئے مضر ہے،مولف نے اذان برقبر کو بدعت ضلالۃ کہاہے،علامہ شامی نے اتارنے کے وقت کو سنت کہاہے،لامحالہ علامہ ابن عابدین الشامی کاقول درست ،جبکہ مولف کا بدعت ضلالۃ کہنا قطعی غلط اور مردود ہے اگر علامہ ابن عابدین شامی نے وقت انزال فی القبر کی قید لگائی ہے تو بھی ہمیں مسلم ہے اس لئے قبر کا منہ کھلا ہوا ہو، یا بند قبر ہی تو ہے اور اذان قبر پر ہی ہو رہی ہے،اور اس مردہ کیلئے ہے جس کو قبر میں اتارا جا رہا ہے،

کتابچہ کے ص، ۴۲ پر حضرت عمر کے بارے میں جو تحریر کیا گیا ہے وہ حق ہے لیکن حضرت عمر کو یہ اعزاز اور شرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور اطاعت کی بدولت حاصل ہوا اور یہ حضرت عمر کی کرامات میں سے ہے،سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ اللعالمین ہیں،آپ کی موجودگی میں شیطان کسی کو ورغلانے ، پھسلانے کی ہمت نہیں رکھتا، ہر مقام اور ہر آن میں ہر شخص کو اپنے دام تزویر میں پھانسنے کی صلاحیت اس نے اللہ سے مانگ کر لی ہوئی ہے،شیطان نے اللہ تعالیٰ کی عزت اور جلال کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اعلان کیا ہوا ہے کہ تیرے مخلص بندوں کے علاوہ میں سب کو ورغلانے ، پھسلانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑونگا، اس کا ہر آدمی کو بہکانا، پھسلانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی اجازت اور مہلت کی بناء پر ہے،حضرت عمر کو دیکھ کر شیطان راستہ بھول جاتا ہے اور چھوڑ دیتا تھا،معراج کی شب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو کمزور عورت اور شیطان کو ضعیف ،کمزور بوڑھے کی شکل میں دیکھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توجہ نہ فرمائی ،صدقہ فطر کی کھجوریں آئیں ،حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چوکیدار مقرر ہوئے ،شیطان بوڑھا عیال دار بن کر آتا رہا، آخری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے فرمایا جو رات کو کھجوروں کی چوری کیلئے آتا رہا ہے ،وہ شیطان تھا، ،رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں شیطان کا وجود ثابت ہے ،مولف کتابچہ نے

جواب نمبر ۳ میں جولکھا ہے وہ ایک علمی بھول ہے، اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، تلاوت قرآن پاک کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ برکت اور تیمن کیلئے پڑھنا الگ بات ہے، آیۃ الکرسی کو سونے سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوہریرہ کو مخاطب فرما کر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ بستر پر سوتے وقت آیۃ الکرسی کو پڑھا کرو، مشکوۃ شریف کی حدیث ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی موت کے علاوہ دخول جنت میں اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں، احادیث مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیۃ الکرسی پڑھنے کا وقت اور محل متعین فرمادیا ہے ہاں آیۃ القرآنیہ ہے اس کے پڑھنے سے بھی ثواب ملے گا، لیکن اذان کا معاملہ اس کے برعکس ہے اذان ذکر ہو کر باعث اطمینان ہے، اذان تکبیر، کلمہ توحید، کلمہ شہادت پر مشتمل ہو کر تلقین ہے، جن مسائل اعتقادیہ کی ضرورت قبر میں میت کو درپیش ہے، ان کا مجموعہ ہے، کلمات طیبات نورریز ہونے کی وجہ سے دافع شیطان ہیں، اللہ کا ذکر ہے جو اللہ کی زمین میں اللہ کے بندے کیلئے نشر کیا جارہا ہے ، اذان دینے سے یہ تمام فوائد بیک وقت حاصل ہوتے ہیں اس لئے بعد از دفن اذان برقبر کو مختص کیا گیا ہے، مولف کتابچہ نے ص، ۳۲ پر لکھا کہ شیطان کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے مرتے ہی انسان کا تعلق شیطان سے ختم ہو جاتا ہے،

مولف کا یہ خیال ہے ان کی اپنی سوچ ہے شیطان انسان کا دشمن ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ان الشیطن للانسان عدو مبین '' کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے، شیطان کی عداوت انسانیت کے ساتھ مربوط اور مضبوط ہے، آیہ کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں انسان ہے وہاں شیطان کی عداوت موجود ہے، آیہ مقدسہ قضیہ مشروط عامہ کے حکم میں ہے یعنی الشیطان عدو الانسان مادام شیطانا ، جب تک شیطان شیطنیت کے اوصاف سے متصف ہے وہ دشمن

انسان ہے، اسی طرح ''کل انسان معدو الشیطن مادام انسانا'' اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کیا ہے، انسان روح اور جسم کے مجموعے کا نام ہے اگر روح اور جسم دونوں موجود ہوں، تو زندہ انسان ہے اور فقط جسم ہو روح نہ ہوتو مردہ ہے، اس تفصیل کے بعد آیئے دیکھیں کہ کیا انسان کا تعلق زندگی کے ساتھ ہے یا مرنے کے بعد بھی باقی رہنا ہے، شیطان کی شیطنیت کو انسانی زندگی کے ساتھ مربوط اور معلق کرنا عقل اور نقل کے خلاف ہے، وجہ یہ کہ جناب آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام جنت میں تھے، جنت میں نہ دن ہے نہ رات، دونوں زندہ ہیں ان پر کوئی حکم فرض نہیں ہوا کہ شیطان ان کو روکے، ورغلائے، پھسلائے نہ انسان کی مصروف دنیاوی زندگی ہے نہ احکامات کی فرضیت، دنیاوی زندگی تو دنیاوی شب و روز کے گزرنے کا نام ہے، جنت میں انسان ہیں، زندہ ہیں، مگر دنیاوی زندگی نہیں، معلوم ہوا شیطان کی عداوت کا تعلق دنیاوی زندگی سے نہیں بلکہ انسان سے ہے، شیطان نے ان کو جنت میں ورغلایا جیسا کہ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا: ''فازلمها الشیطان فاخرجهما مما کانا فیه، وقلنا اهبطوا منها'' الایه

جو شخص مر کر قبر میں پہنچ گیا ہے سوالات کے وقت وہ کامل اور مکمل زندگی کا حامل ہوتا ہے بلکہ فرشتوں کی آمد سے قبل ہی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے جیسا کہ احادیث مبارکہ میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے اس کے بعد فرشتے اس سے سوالات کرتے ہیں، فرشتوں کی آمد سے قبل جب اس میں روح لوٹا دی گئی اور وہ زندگی کے تمام اوصاف اور انسانیت کے تمام لوازمات سے متصف ہے تو حکم قرآن کی روشنی میں شیطان کی عداوت اس کیلئے ثابت اور متحقق ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ مکمل انسان نہیں احادیث اور آیات قرآنیہ کے خلاف لازم آئیگا مرنے کے بعد بھی اس پر انسان کا اطلاق اور عرف موجود ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کل مومن اخوۃ یہ موجبہ کلیہ ہے ہر فرد مومن زندہ ہو یا مردہ ہر ایک پر حاوی اور ہر فرد کو شامل ہے،

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ربنا اغفر لنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان'' جو

لوگ صدیوں قبل وصف ایمان سے متصف ہو کر دنیا سے چل بسے، قرآن نے ان پر بھی اخوانا کا اطلاق کیا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان مرنے کے بعد اس پر انسان اور اور اخوان کا اطلاق موجود ہے یہ الگ بات ہے کہ افراد زندہ بھی ہیں اور مردہ بھی، حدیث پاک میں ہے، جب کوئی مسلمان اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے اس کو سلام کہتا ہے تو قبر میں مدفون بندہ مومن اس کو پہچانتا اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے دوسری حدیث میں ہے کہ "ان المیت یعر من یغسلہ ومن یحملہ ومن یدلیہ فی حفرتہ" (طبرانی)

بے شک میت اپنے غسل دینے والے اٹھا کر لے جانے والے اور قبر میں اتارنے والے کو پہچانتی ہے،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ وہ جانے والوں کے جوتوں کی آہٹ بھی سنتا ہے ثابت ہوا کہ میت سے اوصاف انسانیت قبر میں جانے کے بعد بھی سلب نہیں ہوتے، رہی شیطان کی دشمنی تو وہ سوالات، جوابات کے وقت تک باقی اور دائمی ہے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے جس کا ایک جملہ یہ بھی ہے،

"واعوذبک من ان یتخطنی الشیطن عندالموت" (ابوداؤد، نسائی)

اے میرے پروردگار موت کے وقت شیطان کے بھکاوے سے تیری پناہ مانگتاہ،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان تعلیم امت کیلئے ہے ورنہ آپ کے بارے میں ورغلانے، مکالمہ شیطانی کا تصور کرنا بھی کفر ہے لیکن اس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بندہ مومن کیلئے کٹھن وقت اور مشکل ترین مقام موت اور قبر ہے، ان مقامات پر شیطان انسان کی ایمانی قوتوں کو سلب کرنے کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا، نوادر الوصول کے مولف امام محمد بن علی ترمذی ہیں جو اس روایت کو امام سفیان ثوری سے نقل فرماتے ہیں، کہ جب بندہ مومن سے قبر میں سوالات کئے جاتے ہیں تو اس وقت اس کو شیطان دکھائی دیتا ہے ور وہ اپنی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ بے شک میں تمہارا رب ہوں، قبر کے اندر دیکھتا ہے یا قبر کے اوپر باہر دکھائی دیتا ہے اس کی کوئی

تخصیص یا تفتیش بیان نہیں کی گئی جس سے دونوں طرح کا دکھائی دینا ممکن ہے، جب یہ امر منصوص علیہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا با اختیار اور طاقتور دشمن ہے تو جہاں انسان کا جوود پایا جائیگا وہاں شیطان موجود، اس کا اثر، نفوذ اور دسترس بھی موجود ہوگی، للہذا شیطان کیلئے کوئی امر مانع نہ ہے کہ انسان کے سوالات اور جوابات کے وقت وہ موجود نہ ہو، اور اس کا اثر، نفوذ اور تسلط قائم نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ اپنے بھائی کیلئے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے سوالات کیے جائیں گے، امام محمد ترمذی مزید فرماتے ہیں، میت کو دفنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ: "اللھم اجرہ من الشیطن فلولم الشیطن ھناک سبیل ما دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذالک "(ایذان الاجر) اے اللہ اس کو شیطان سے بچا، اگر شیطان کا وہاں کوئی عمل دخل نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا کیوں فرماتے؟

بہر حال شیطان قبر کے اندر ہو یا باہر میت کو دکھائی دیتا ہے اور اس کے ورغلانے پھسلانے کیلئے بھر پور حملہ کرتا ہے، میت کیلئے شیطان کا دکھائی دینا کوئی امر محال نہیں کیونکہ میت کیلئے حس ادراک اور روئت، احادیث اور آثار سے ثابت ہے،، دنیا میں شیطان اور اس کا لشکر ہر انسان کو دیکھتا ہے مگر انسان دنیا میں شیطان اور اس کے لشکر کو نہیں دیکھ سکتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''من حیث لاترونھم'' مگر قبر میں جانے کے بعد میت شیطان کو دیکھتی ہے، لاریب فیہ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں،، ''مثل ابلیس ای فی طی الارض لہ حتی یوسوس من فی الشرق والغرب، جریہ مجری الدم لبنی آدم، ونحوذالک''

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمن کو بھی مافوق الفطرت کام کرنے کی قوت اور استطاعت دے رکھی ہے، مثلاً شیطان پوری سرزمین میں مشرق ہو یا مغرب آن واحد میں طے کرتا، اور لوگوں کے دلوں میں شیطانی وسوسہ ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے،،

اس سے ثابت ہوا کہ شیطان لامحدود قوت کا حامل اور مالک ہے اور یہ سب طاقت اور تصرف اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اتنی قوت اور روئت، اس لئے دی گئی کہ نوع انسانی مشارق اور مغارب کی پہنائیوں تک آباد اور پھیلی ہوئی ہے، شیطان نے نوع انسانی کو بہکانے، ورغلانے کی قسم کھارکھی ہے، اس لئے انسان اور انسانی بستیوں تک اس کو دسترس حاصل ہے اور اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے ''ان الشیطان للانسان عدو مبین'' میں ارشاد فرمایا ہے؟

قابل غور امر یہ ہے کہ شیطان کیلئے مشرق ومغرب دور ہیں، یا سطح زمین سے ایک گز نیچے قبر میں جانے اور لیٹنے والا انسان دور ہے، اگر مشرق میں ہوتے ہوئے مغرب میں وسوسہ ڈال سکتا ہے تو زمین کے اوپر ہوتے ہوئے ایک گز نیچے وسوسہ ڈالنے بہگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟ بلکہ بحکم حدیث انسان کے جسم مین شیطان کا عمل دخل اس طرح ہے جس طرح اس کی رگوں میں خون کی گردش ہے، انسانی جسم کے ہر حصے میں خون کی گردش موجود ہے، اسی طرح شیطان بدن انسانی کے ہر حصے پر قادر اور متصرف ہے، قبر میں جانے والا شخص انسان کامل ہے، روح سوالات وجوابات سے قبل اس میں لوٹا دی گئی ہے، شیطان وہاں بھی اس بندہ مومن کو بہکانے، ورغلانے کی پوری کوشش کرتا ہے، شیطان کے بہکاوے کا یہ عمل اور یہ کوشش نہ محال عقلی ہے اور نہ محال شرعی، تدبر، تفکر

مولف کتابچہ نے اذان برقبر کی ممانعت اور بدعت ضلالۃ پر آیہء کریمہ ''وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا'' بھی نقل کی ہے اور یہ کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اذان بر قبر نہیں دی، صحابہ تابعین نے نیں دی لھذا منع ہے جو چیز جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کی اور نہ حکم دیا ہے اس کا کرنا بدعت ضلالۃ ہے اس پر مختصراً چند کلمات پہلے گزر چکے ہیں یہاں آیہء کریمہ کی تھوڑی سی وضاحت کرنا مقصود ہے،

ترجمہ: یہ ہے جو چیز، جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کرنے کیلئے تمہیں دیا اسکو مضبوطی سے

پکڑلو، اور جن چیزوں کے کرنے سے منع فرمایا ہے ان سے رک جاؤ، اب دیکھنا یہ ہے کہ اذان بر قبر کے موضوع اور مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کیا فرمایا ہے اور کس سے منع فرمایا ہے : "وما اتاکم، وما نھاکم" کے الفاظ اس بات کا لغوی اور اصطلاحی تقاضا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واضح اور انفرادی فرمان بصورت امر ہو، یا ذاتی عمل، بصورت نفی ہو یا نہی اور موجود فی الخارج ہوتا کہ امر کا عمل اور ممانعت کا حکم متحقق ہو سکے، اگر امر اور نہی موجود فی الخارج نہ ہوں تو اس آیت سے استدلال کرنا قطعی غلط اور بے محل ہوگا، مانعین اذان بر قبر قیامت تک کوئی ایسی حدیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذاتی عمل پیش نہین کر سکتے جہاں اذان بر قبر کو منع فرمایا گیا ہو، مولف کتابچہ نے آیہء کریمہ کی جو تفسیر بیان کی اور اس سے جو رائے قائم کی وہ ان کی ذاتی رائے ہے تفسیر بالرائے ہے جو موجب جہنم ہے، اسی آیہء کریمہ کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی بیان فرماتے ہیں :"والمعنی حینئذ ما اتا کم الرسول من الامر ،فتمسکوا بہ وما نھا کم عن تعاطیہ فانتھوا عنہ"

کہ وما اتاکم الرسول کا معنی یہ ہے کہ جس کام کے کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑلو اور جسکا حکم نہیں دیا بلکہ منع فرمایا ہے اس سے رک جاؤ، مفسر کی تفسیر سے ثابت ہوا کہ وما اتاکم سے مراد، امر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، اور وما نھاکم سے مراد نہی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، مولف کتابچہ بتائیں کہ کس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اذان بر قبر سے منع فرمایا ہے، یا وہ کونسا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذاتی عمل ہے جس سے قبر پر اذان نہ دینے کا ثبوت ملتا ہے ،جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول یا فعل کے ذریعے منع ہی نہیں فرمایا تو آپ لوگوں کا سنیوں کو قبر پر اذان دینے سے منع کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اور کس دلیل کی بناء پر ہے؟

علامہ مزید فرماتے ہیں کہ :"واستنبط من الایۃ ان وجوب الترک یتوقف علی تحقق النھی ولا یکتفی فیہ عدم الامر فما لم ینعرض لہ امر ولا نھیا لا یجب ترکہ" (روح المعانی)

اس آیہءکریمہ سے یہ بھی استنباط ہوا کہ کسی چیز کا چھوڑنا اس وقت واجب ہوگا جبکہ اس کی ممانعت موجود ہو اور بصیغہ نہی ہو، چھوڑنے کیلئے یہ کافی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم نہیں دیا، وہ امور جن کیلئے نہ حکم ہے اور نہ منع کیا گیا ہے ان کا چھوڑنا ضروری نہیں،،

علامہ موصوف کی تفسیر اور استنباط سے روز روشن کی طرح واضح اور ثابت ہوا کہ اس کام کا چھوڑنا ضروری ہے جس کے کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہو، اور اس پر نہی کے ذریعے ممانعت کا حکم صادر فرمایا ہو، محض اس بناء پر اس کام کو نہیں چھورا جائیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا حکم نہیں فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا، اور مزید یہ کہ جس چیز کے کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم نہیں فرمایا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس کا چھوڑ دینا بھی ضروری نہیں، جو لوگ قبر پر اذان دینے سے منع کرتے ہیں ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ خود دی اور نہ حکم دیا، صحابہ، تابعین نے نہ خود دی اور نہ حکم دیا لہٰذا اذان دینا منع ہے اور بدعت ضلالۃ ہے، مفسر مذکور کی تفسیر کی روشنی میں ان کا یہ اعتراض غلط اور خود اس آیہءمقدسہ کے خلاف اور منافی ہے،

علامہ موصوف نے تصریح فرمادی ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا اور نہ ہی منع کیا گیا ہے تو اس کا کرنا جائز ہے، ممنوع یا مذموم نہیں، اس کا چھوڑنا ضروری نہیں، تعجب ہے کہ مولف نے اپنے موقف کی تائید میں آیہ مقدسہ کو کس طرح نقل کیا ہے،

مولف نے لکھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر مومن میں موجود ہیں تو شیطان وہاں کیسے ٹھہرے گا، مولف نے یہ بھی لکھا ہے کہ بریلویوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، تو پھر شیطان وہاں کیسے آئیگا، مولف نے اہل سنت وجماعت پر الزام تراشی کی ہے اور عقیدہ حاضر وناظر کو غلط انداز میں پیش کیا ہے، ہمارا عقیدہ مسئلہ حاضر وناظر میں وہی ہے جو شیخ محقق شاہ عبد الحق محدث دہلوی کا عقیدہ ہے، آپ نے فرمایا ''وے علیہ السلام بر احوال واعمال امت مطلع

است، برمقربان وخاصان درگاه رامفیض وحاضروناظراست‘‘

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے حالات اوران کے اعمال پر مطلع ہیں جولوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مقرب اور مخصوص ہو گئے ہیں آپ براہ راست ان کو فیض سے نوازتے ہیں، اوران کے لئے حاضراور ناظر یں، مزید فرمایا:’’دریں مسئلہ خلافے نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحقیقت حیات بے شائبہ مجاز وتوہم تاویل دائم وباقی است وبراعمال امت حاضر وناظر است، ومرطالبان حقیقت راومتوجہاں انحضرت را مفیض ومربی ‘‘(مکتوبات) ترجمہ: اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر کسی شائبہ مجاز اوروہم تاویل کے اپنی حقیقی زندگی کے ساتھ قائم اور دائم ہیں اوراپنی امت کے حالات پرحاضر وناظر ہیں، اور جولوگ راہ حقیقت کے طالب ہیں، ان کی طرف توجہ فرماتے ہیں،

امت کے اعمال پرحاضراورناظر ہیں جولوگ راہ حق کے متلاشی اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات شریفہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں ان کی فیض رسانی فرماتے ہیں، اوردولت تربیت سے مالا فرماتے ہیں،،

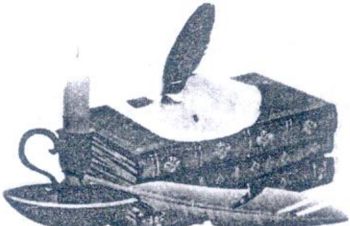
مولف نے اہل سنت وجماعت کی کس مستند کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مرنے والے کی قبر میں جلوہ فرماہوتے ہیں ،،امام قسطلانی نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر میں زیارتکے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:’’یکشف للمیت حتی یری النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وھی بشری عظیمۃ للمومن ان صح ذالک ولا نعلم حدیثا صحیحا مرویا فی ذالک، والقائل بہ انما استندلمجردان الاشارۃ لاتکون الاللحاضر لکن یحمل ان تکون الاشارۃ لمافی الذھن فیکون مجازا‘‘

کہ میت کے سامنے سے حجابات اٹھادیئے جاتے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیتا ہے اور مومن کیلیئے یہ بہت بڑی خوشخبری ہے اگر یہ صحیح ہے اس موقف پر کوئی صحیح حدیث ہماری نظر سے نہیں گزری جو یہ کہتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ ھذا اسم اشارہ ہے اوراس سے اشارہ حاضر کی

طرف ہی کیا جاتا ہے لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مومن کے ذہن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو تصور
اور خاکہ موجود ہے ھذا سے اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہو،،
بحر حال دونوں صورتوں کا احتمال ہے ممکن ہے مقربین اور خاصان بارگاہ کو ذات اقدس کا دیدار
بخشا جاتا ہو اور عام مومنین سے اسی تصور کے متعلق پوچھا جاتا ہو یا اللہ کی عنایت اور مہربانی سب
مومنین کے شامل حال ہو اور سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار بخشا جاتا ہو،، امام قسطلانی کی
تقریر کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مومن کی قبر میں جلوہ فرما ہوتے ہیں
، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں شیطان کا میت پر داؤ بھکاؤ نہیں چل سکتا، ہاں یہ ضروری ہے
کہ بندہ مومن کے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ تصور ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے رسول
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آخری نبی ہیں، اللہ کے محبوب ہیں، ساری مخلوق سے افضل اور اعلیٰ ہیں، اپنی پوری
امت کے احوال اور اعمال سے باخبر ہیں، یہ عقیدہ اور یہ تصور نہیں ہونا چاہیے، کہ وہ ہم جیسے بشر ہی
ہیں، انہیں کسی چیز کا علم نہیں، وہ کسی چیز کے مالک اور مختار نہیں، یہ عقیدہ قرآن وسنت اور اجماع
امت کے خلاف ہے اور سراسر بے دینی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت تہتر
فرقوں میں بٹ جائیگی، بہتر جہنمی اور ایک جنتی ہوگا اور وہ ھی الجماعۃ یعنی اہل سنت و جماعت ہوں
گے، دوسری حدیث میں فرمایا ید اللہ علی الجماعۃ، اللہ کی عنایت، نصرت، اسی جماعت کو حاصل ہو
گی، اور یہی سواد اعظم ہے، تم اسی کی پیروی کرو، (الحدیث)
دیگر تمام فرقے اس کثرت سے محروم ہیں، سنی العقیدہ مسلمانوں پر لازم ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
فرمان کے مطابق اہل سنت و جماعت سے وابستگی رکھیں، اور مسلک اہل سنت و جماعت کی نشر
واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں،،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا بعد از نماز جنازہ



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء، قاضی محمد عظیم نقشبندی

دعا بعد از نماز جنازہ بدعت نہیں

فقہاء عظام نے بدعت کی تعریف میں فرمایا: "ماا حدث علی خلاف الحق الملتقی عن رسول اللہ ﷺ من علم او عمل او حال" وہ امر حق جو رسول اللہ ﷺ سے بطریق تواتر منقول ہو اس کے خلاف کسی امر کو علم، عمل اور حال کے ذریعے ایجاد کرنا بدعت ہے، (ردالمختار،، ۵۶۰) دعا بعد از نماز جنازہ، علمی، عملی، حالی احداث اور جدت نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے قول اور عمل کا امتثال ہے اس دعا کو بدعت کہنا بذات خود ایک بدعت ہے،

اور یہ کہنا کہ نماز پڑھ لینے کے بعد دعا کی ضرورت نہیں کیونکہ نماز جنازہ میں "اللھم اغفر لحینا و میتنا و شاھدنا، الخ" دعا موجود ہے اور پڑھ لی گئی ہے غلط ہے (۱) محتاج دعا حاضر میت ہے نہ کہ تمام فوت شدہ ایمانی مخلوق، (۲) یہ دعا صدیوں پہلے انتقال کرنے والے مومنین کیلئے مفید اور سب کو محیط ہے، اس میں عموم ہے وقت اور تشخص کی تخصیص نہیں، بلکہ یہ دعا صفوں میں کھڑے حاضرین کیلئے بھی ہے حالانکہ وہ زندہ ہیں حاضرین کے علاوہ غیر حاضرین مومنین، مومنات کو بھی شامل ہے بلا امتیاز مرد و زن، چھوٹوں، بڑوں کو بھی شامل ہے دوران نماز جنازہ جو فرض عبادت ہے، اگر بلا تفریق جائز اور لازمی ہے تو حاضر میت کیلئے بعد از نماز جنازہ کیوں بدعت اور مکروہ ہے؟ دعا ایک ایسی فرض عبادت ہے جس کا نہ کوئی وقت معین ہے نہ جگہ، ہر جگہ، ہر وقت دعا کا عمل جائز اور مشروع ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اجیب دعوۃ الداع اذا دعان" آیہء کریمہ میں اذا ظرف ہے، ظرف زماں اور مکاں دونوں کو شامل ہے آیہء مقدسہ کا معنی یہ ہے کہ مجھے پکارنے والا جس جگہ اور جس وقت پکارے گا میں اس کو مدد، اور فضل و کرم سے بھرپور جواب دونگا، یعنی اس کی دعا کو قبول فرماؤنگا، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مطلق اور عام ہے جس کی کوئی تخصیص اور جس کیلئے کوئی تعیین اور جس کیلئے کوئی قدغن نہیں، نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے پر بدعت اور کراہت کی قدغن لگانا نص صریح پر واضح زیادتی

ہے کسی طور پر جس کا کوئی جواز نہیں،،

حدیث سے نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد میت کی بخشش کے لیے دعا مانگنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل اور صحابہ کے عمل سے ثابت ہے، واقدی نے مغازی میں جنگ موتہ کے ذکر میں نقل کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''صلی علیه ودعا له وقال استغفروا له'' اور ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کیلئے دعا فرمائی، صحابہ کرام سے فرمایا! تم بھی ان کیلئے دعائے استغفار کرو، پھر فرمایا! اب اسلام کا جھنڈا جعفر بن ابی طالب کے ہاتھ میں ہے، وہ بھی قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں، ''وصلی علیه رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ودعا له وقال استغفروا له'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کے لیے دعا فرمائی، اور صحابہ سے فرمایا تم بھی ان کیلئے دعا مغفرت کرو،،

واقدی نے اپنی مغازی میں اس حدیث کو دو طریقوں سے روایت کیا ہے، اس حدیث کو ملا علی قاری نے مرقات، جلد ۴، ص، ۴۶، محقق ابن الہمام نے صلوۃ علی المیت، کے تحت فتح القدیر، حافظ عماد الدین ابن کثیر نے بھی البدائیہ والنہایہ میں یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے،، محقق ابن الہمام اور ملا علی قاری اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے، اور حدیث مرسل حدیث صحیح ہے اور قابل حجت ہے، علامہ شبیر احمد عثمانی نے نقل کیا: وقال بعض الائمة الحديث المرسل صحيح يحتج به وهو مذهب ابى حنيفة ومالك واحمد فى روايت المشهورة حكاها النووى وابن القيم، وابن كثير وغيرهم وجماعة من المحدثين وحكاه النووى فى شرح المهذب عن كثيرين من الفقهاء اواكثرهم، وقال نقله الغزالى عن الجماهير'' (مقدمہ فتح الملہم، ۳۴)

معلوم ہوا نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد دعا حدیث مرسل سے ثابت ہے اور حدیث مرسل صحیح حدیث اور حجت ہے، اس حدیث میں دو مرتبہ نماز جنازہ پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

دعا فرمائی اور صحابہ کو دعا کرنے کا حکم فرمایا،

لہٰذا نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد دعا مانگنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ کی پیروی ہے، بدعت نہیں، بدعت تو تب ہوتی جب آپ کے طریقہ حسنہ کے خلاف ہوتی، دعا بعد نماز جنازہ حدیث مرسل سے ثابت ہے اسی لیے امت محمدیہ کی اکثریت صدیوں سے اس پر عمل پیرا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالی شان ہے :"ماراه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن" مسلمانوں کی اکثریت نے نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد میت اور پہلے سے فوت شدہ مسلمانوں کی بخشش کیلئے دعا مانگنے کو امر حسن سمجھا اور قرار دیا لہٰذا حدیث پاک کی روشنی میں دعا بعد از نماز جنازہ امر حسن ہے اور جو امر حسن مسلمانوں کا معمول ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی حسن ہے،، بالفرض اگر دعا بعد نماز جنازہ بدعت ہی ہوتی تو پھر بھی بدعت حسنہ ہے بدعت سیہ نہیں، بدعت حسنہ کار خیر ہو کر موجب خیر ہے،، موجودہ زمانے اور موجودہ امور کا تقابل زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دور صحابہ اور تابعین سے کیا جائے تو دور حاضر اور اس کی جدت طرازیاں بدعت کا بحر بیکراں نظر آتی ہیں،، ایسی صورت میں بدعات زمانہ کو ترک کرنا واجب ہوگا،

مسجد دور قدیم، ظہور اسلام سے قبل بھی عبادت گاہ اور مرکز تبلیغ، اور جائے رشد و ہدایت رہی ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:"ماامرت بتشيد المساجد، قال ابن عباس لتزخرفنها كماذخزفت اليهودوالنصارى" (ابوداؤد)

مجھے مساجد کی پختگی، زیبائش، آرائش، اور تزیین کا حکم نہیں دیا گیا، یعنی مساجد کا بلند عمارت ہونا، ان کو پختہ تعمیر کرنا، ان کی زیبائش وزینت میں حد سے گزر جانا اسلامی منشور کا حصہ نہیں،،

ایسا کرنا اسلام کا عمل ہے نہ تقاضا بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ طریقہ یہود و نصاری کا ہے، مگر مسلمان ضرور ضرور اپنی مساجد پر یہ عمل کریں گے، مذکورہ بالا اس حدیث کا مفہوم اور مضمون دو امور پر مشتمل ہے، (۱) مساجد کی پختگی، آرائش، زیب وزینت اسلام میں ہے نہ

میری سنت ہے، (۲) یہود ونصاری کا طریقہ ہے، دیکھنا یہ ہے کہ پوری دنیا میں پائی جانے والی مساجدان صفات سے متصف نہیں؟ اگر متصف ہیں اور یقینا متصف ہیں تو یہ، سنت کی خلاف ورزی نہیں؟ علی الاعلان سنت کی خلاف ورزی ہے، مطابق حدیث یہود ونصاری کی پیروی نہیں؟ یقینا پیروی ہے مضامین حدیث کو سامنے رکھ اور سمجھ کر بتایا جائے کہ ضمیر انسانی، اور فیصلہ ایمانی اس پر کیا فتوی دیتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں لی آج کی تبلیغ جلب زر کی مرہون منت ہے، جبے، قبے، کا کروفر کیا عین سنت ہے؟ لاؤڈ سپیکر کس حدیث سے ثابت ہے؟ جہاد بالسنان وسیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، میزائل اور ایٹمی جنگ کے اس دور میں سپاہ اسلام کو دفاع اور جہاد کیلئے تیر اور تلوار تھما دینا سنت ہوگا؟ سفر کیلئے دور رسالت کی سواری کا انتخاب کرنا ترجیح دینا ہوگا تا کہ بدعت سے بچا جائے، اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل ہو سکے، قرون اولیٰ میں درس نظامی کے مروجہ علوم وفنون کہاں تھے؟ مگر صدیوں سے شیخ، امام، محدث، مجدد اور مفسر بننے، بنانے کیلئے ان علوم کو پڑھا پڑھایا جا رہا ہے، یہ کسی سنت کی پیداوار نہیں بلکہ بدعت ہے، درس نظامی کے زیر اہتمام صدیوں پر محیط مدارس کے در ودیوار بدعات سے گونج رہے ہیں، نماز جنازہ کے بعد دعا کو بدعت کہنے والوں کی نظروں سے بدعات کا یہ بحر ذخار کیوں اوجھل ہے؟

اگر ماحولیاتی تبدیلی ضروریات زندگی کی جدت امر مجبوری اور وجہ جواز ہے تو دعا بعد نماز جنازہ کی ضرورت اور جوازیت موجود ہے مرور زمانہ نے اسلامی زندگی کو متاثر کیا ہے، اعتقادی اور فکری تغیر نے مسلمانوں کی عملی زندگی کو بری طرح متاثر بلکہ مفلوج کر دیا ہے ہر مسلمان دعائے استغفار کا محتاج ہے، جنگ موتہ میں زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو دعائے استغفار کرنے کا حکم فرمایا، باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی یہ حضرات راہ خدا میں شہید ہوئے، جنت میں داخلہ بھی مل گیا، سارا

معرکہ اور تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچشم خود ملاحظہ کیں اور لمحہ بہ لمحہ صحابہ کرام کو آنکھوں دیکھا حال بھی بتایا، نجاشی شاہ یمن کی نماز جنازہ پڑھائی، صحابہ کرام نے صفیں بنا کر آپ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی پھر بھی فرمایا: استغفروا لاخیکم اپنے مومن بھائی نجاشی کیلئے دعائے استغفار کرو، حالانکہ نجاشی کے جنازے میں ہزاروں کی تعداد میں فرشتے بھی شریک تھے، جب یہ امور واقعیہ ہیں تو پھر دعائے مغفرت کیوں فرمائی اور حکم کیوں فرمایا؟ یہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد دعا ہے، دعا کا انکار کرنا کوتاہ علمی اور کج فہمی ہے،،

دور حاضر کا مسلمان بے عملی، بداعتقادی کا شکار ہے، دعائے مغفرت کا محتاج ہے، اس لیے نماز جنازہ کے بعد جگہ چھوڑ کر اور صفیں توڑ کر دعا کی جاتی ہے، اور بارگاہ خداوندی میں یہ دعا قبول ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالی شان ہے: **مامن احد یدعوا بدعاء الا اتاہ اللہ ماسأل** "**الحدیث**، (ترمذی) جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعے جو مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتا ہے،، حدیث شریف میں حصر اور قصر کے ذریعے سوال کے پورا کیے جانے کی بشارت دی گئی ہے، سائل کی دعا کو قطعاً رد نہیں کیا جاتا، جنازہ میں شریک مسلمانوں کا اجتماعی دعا کرنا میت کی بخشش کیلئے ایک موثر ذریعہ ہے، دعا میں اٹھے ہوئے یہ ہاتھ بالکل خالی نہیں لوٹتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیہ ان یردھما صفرا**" (ترمذی، ابوداؤد، بیہقی)

تمہارا رب حیاء دار ہے، کریم ہے، وہ اپنے بندے سے حیاء فرماتا ہے، جب وہ ہاتھ اٹھائے دعا میں اور ان کو خالی لوٹائے،،

نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنا میت کے حق میں انتہائی مفید اور باعث بخشش ہے،، اللہ تعالیٰ ان سینکڑوں پھیلائے ہوئے ہاتھوں کو کبھی خالی نہیں لوٹاتا،،

مفتی نے نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کو بدعت تحریر کیا ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

،صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، امام، دیگر فقہاء سے ثابت نہیں ہے، فقہائے کرام نے دعابعد ازنماز جنازہ کو سختی سے منع فرمایا ہے،، مفتی اگر دیانت وامانت کے اجالے میں علمی بصیرت سے کام لیتا تو سب سے پہلے اس جامعہ کوزیر غور لاتا جس کا فاضل ہونے پر اس کو ناز ہے کیا جامعہ کی عمارات بشمول مسجد اوراس کے متعلقہ امور، تعلیمات، اور مروجہ منتخب نصاب تعلیم بدعات کی تفسیرات اور تعبیرات نہیں ؟ بدعات کی آباد دنیا میں صرف دعابعد از نماز جنازہ کا انتخاب اور انفراد کیوں؟

مفتی نے اپنے موقف کی تائید میں درج ذیل فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں،،

ابوبکر بن الحامد الحنفی نے لکھا ''ان الدعاء بعد صلوة الجنازة مکروہ''نماز جنازہ کے بعد دعامانگنا مکروہ ہے ،شمس الائمہ حلوائی حنفی نے لکھا:''لایقوم بالدعافی قراۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوۃ الجنازۃ وقبلھا''نماز جنازہ پڑھنے سے پہلے اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد تلاوت قرآن کر کے میت کیلئے دعا کی خاطر کھڑا نہ ہو،،

سراج الدین نووی نے فرمایا:''اذفرغ من الصلوۃ لایقوم بالدعاء''نماز جنازہ کے بعد دعا کیلئے کھڑا نہ رہے،،

محمد بن شہاب نے فرمایا:''لایقوم بالدعاء بعد صلوۃ الجنازۃ لانہ دعامرۃ''نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد کھڑا نہ رہے کیونکہ اس نے ایک مرتبہ دعا کر لی ہے،،

محمد غراسانی نے لکھا:''لایقوم داعیالہ''میت کی خاطر دعا کرنے کیلئے کھڑا نہ رہے،،

ابن نجیم حنفی نے فرمایا:''ولایدعوابعدالتسلیم''سلام پھیرنے کے بعد دعا نہ کرے،،

نصیرالدین حنفی نے فرمایا:''بعد ایستادہ نماند برائے دعا''نماز جنازہ پڑھنے کے بعد دعا کیلئے نہ ٹھہرے، کھڑا نہ رہے،،

ملاعلی قاری نے فرمایا:''ولایدعوللمیت بعد صلوۃ الجنازۃ لانہ یشبہ الزیادۃ فی صلوۃ

الجنازۃ"نماز جنازہ پڑھنے کے بعد میت کیلئے دعا نہ کرے کیونکہ اس سے نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ ہوتا ہے،،

مندرجہ بالا فقہاء کرام کی عبارات واضح ہیں، ان میں کوئی ابہام یا اخفاء نہیں، ان عبارات میں لایقوم کا لفظ ہے، نصیر الدین حنفی نے :لایقوم کا معنی فارسی میں ایستادہ نماند کیا ہے، مفتی نے لایقوم کا معنی کیا ہے،، نہ ٹھہرے،،

لایقوم کا معنی ہے اسی جگہ کھڑا نہ رہے جس جگہ کھڑے ہو کر اس نے نماز جنازہ پڑھائی ہے، لایدعوا فعل مقید ہے بعد صلوۃ الجنازۃ کی قید سے، بعد صلوۃ الجنازۃ، ظرف زمان ہے، لایقوم کا حکم مقید ہے اور اس کی قید وقت خاص ہے اور وہ بعد التسلیم ہے للدعا للمیت مفعول لہ ہے، لایقوم للدعاء کا حکم نہی بعد التسلیم کے ساتھ مختص ہے، عبارت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ نماز جنازہ کا سلام پھیرنے کے بعد اسی جگہ ٹھہر کر یا کھڑا رہ کر میت کیلئے دعا نہ کرے کیونکہ ایسی صورت میں دعا کرنا نماز جنازہ پر زیادتی تصور ہوگی، میت کیلئے دعائے مغفرت کرنا نماز جنازہ کا ایک رکن تھا جو اللھم اغفر لحیینا الخ، کی صورت میں ادا ہو چکا ہے، دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں اگر اسی جگہ کھڑا ہو کر اسی ہیئت اور اسی کیفیت میں دعا کرے گا تو یہ نماز جنازہ کے ارکان پر ایک گونہ زیادتی شمار ہوگی جو مکروہ ہے،

فقہاء کا حکم ممانعت مخصوص جگہ، مخصوص حالت اور مخصوص وقت کیلئے ہے، اگر ان امور کی عدم موجودگی پر دعا کی جائے تو ممنوع اور مکروہ نہیں ہوگی، اگر نماز جنازہ کے بعد میت کی بخشش کیلئے دعا مانگنا ممنوع اور مکروہ ہوتا تو فقہاء کرام لایقوم کی جگہ لایدعوا فرماتے ،لایدعوا نہ فرمانا اور لایقوم فرمانا واضح کرتا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد اسی جگہ، اسی حالت، اسی کیفیت میں دعا مانگنا ممنوع اور مکروہ ہے، کیونکہ اس صورت میں نماز جنازہ کے ارکان پر زیادتی متصور ہوتی ہے، اور زیادتی کرنا مکروہ ہے،،

مفتی کی نقل کردہ فقہاء کی عبارات ہم نے نقل کی ہیں، بدعت کا لفظ کسی ایک عبارت میں بھی نہیں ،مفتی نے نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کو بدعت کس اساس اور کس بناء پر کہا ہے؟ فقہاء کرام نے مکروہ کہا ہے مکروہ سے مراد مکروہ تنزیہہ ہے، یعنی خلاف اولیٰ ہے،،

علامہ ابن عابدین شامی نے فرمایا:" ان مرجع کراھة التنزیه خلاف الاولی" (ردالمختار ،۱، ۱۲۳)

مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی نہیں ہوسکتا، علامہ ابن عابدین شامی نے فرمایا:" و بالثانی و الثالث الواجب و کراھة التحریم "یعنی دلیل قطعی الثبوت اور ظنی الدلالتہ ہو، یا ظنی الثبوت اور قطعی الدلالتہ ہو، جیسے آیات موولہ، یا خبر واحد قطعی الدلالتہ تو مکروہ تحریمی ثابت ہوگا،،

دعا بعد از نماز جنازہ کے مکروہ تحریمی ہونے پر دو قسم کی دلیل کی ضرورت ہے یا قطعی الثبوت اور ظنی الدلالتہ نص ہو یا خبر واحد قطعی الدلالتہ ہو، اس عنوان کی کوئی دلیل دعا بعد از نماز جنازہ کی کراہت تحریمی پر وارد نہیں ہوئی، دلیل کے بغیر کوئی حکم ثابت ہوتا ہے نہ ثابت کیا جا سکتا ہے،،

علامہ شامی نے فرمایا:" ولا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراھة اذلا بدلها من دلیل خاص" (ردالمختار، ۱، ۱۲۴)

مستحب کے چھوڑنے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ امر مکروہ تھا، کسی امر کا مکروہ ہونا دلیل خاص کا محتاج ہے ،دلیل خاص مذکورہ بالا دو چیزیں ہیں، نص قطعی اور خبر واحد قطعی الثبوت،،

دعا بعد از نماز جنازہ کے مکروہ سے مراد، مکروہ تنزیہہ ہے، جو خلاف اولیٰ کا نام ہے،، عبارات فقہاء کا مفہوم اور مراد یہ ہے کہ امام اسی جگہ کھڑا رہ کر، ٹھہر کر میت کیلئے دعا نہ کرے، اگر اسی جگہ کھڑا رہ کر دعا کرے گا تو یہ خلاف اولیٰ ہے، اگر خلاف اولی کام ہو جائے تو آسمان سر پر اٹھانے پر کیا ضرورت ہے؟ اور امت کی اکثریت کو بدعتی کہنے کی مجبوری اور جوازیت کیا ہے؟ جرم کے سمندر میں نہانے سے پہلے عبارات فقہاء اور اصول وضوابط کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، مذکورہ بالا

ان فقہاء نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ ’’لانہ یشبہ الزیادة فی صلوة الجنازة‘‘ اسی جگہ کھڑا رہ کر دعا کرنے سے شبہ گزریگا کہ شاید دعا بھی نماز جنازہ کا حصہ ہے، اس وہم سے بچاؤ کی خاطر فرمایا گیا: اذافرغ من الصلوة لایقوم بالدعاء‘‘ مفتی سعد اللہ الحنفی کا حوالہ دیتے ہوئے مفتی نے تحریر کیا کہ: خالی از کراہت نیست زیرا کہ فقہاء بوجہ زیادہ بودن بر امر مسنون منع میکنند،، یعنی فقہاء نے اسی جگہ اسی ہیئت میں کھڑے رہ کر دعا کرنا مکروہ فرمایا ہے، اور یہ مکروہ تنزیہہ ہے، حرام، ممنوع نہیں،، نماز جنازہ میں مسنون امر سلام پھیرنا ہے،، نہ کہ سلام پھیرنے کے بعد میت کیلیئے دعا کی غرض سے اسی جگہ کھڑے رہنا، ٹھہرنا، سلام پھیرنے کے بعد جو دعا کی جاتی ہے یہ امر مسنون پر ہرگز زیادتی نہیں کیونکہ امام اور نمازی صفیں توڑ کر اور جگہ چھوڑ کر دعا کرتے ہیں،،

امر مسنون پر زیادتی اس وقت ہوگی جب اسی جگہ کھڑا رہ کر، ٹھہر کر صفوں کی موجودگی اور ان کی ہیئت پر دعا کی جائے گی، جب مصلائے امامت سے ہٹ کر اور صفوں کو توڑ کر دعا کی جائے تو امر مسنون پر زیاتی کس طرح ہوگی؟

فقہاء کرام کا مکروہ کہنا امر اجتہادی فقہی ہے جس کا حکم خلاف اولیٰ ہے، خلاف اولیٰ کے مقابل اور معارض حدیث مرسل ہے جو حدیث صحیح اور حجت ہے تقابل کی صورت میں حدیث مرسل کا حکم راجح اور خلاف اولیٰ کا حکم مرجوح ہے، پھر بھی دعا بعد از نماز جنازہ ارجح ہے، بدعت اور ممنوع نہیں،،

مفتی نے لکھا کہ نماز جنازہ کی تیسری تکبیر ہی دعا ہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: اذاصلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء‘‘ بھی نقل کیا ہے، جب تم نماز جنازہ پڑھو تو میت کیلیئے خالص دعا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان جزو ایمان ہے لیکن اس کا مفہوم وہ نہیں جو مفتی نے تحریر کیا ہے، اگر وہی ہو تو پھر ان آیات بینات کا معنی کیا ہوگا؟

’’اذاقمتم الی الصلوة فاغسلوا وجوهکم الایه‘‘ قمتم کا معنی نماز کیلیئے ارادہ کرنا، اور نماز

کیلئے اٹھنا ہے، قیام مرادنہیں، ”اذا طعمتم، فانتشروا“ کا معنی ہے جب تم کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ،، پہلی آیت میں قمتم فعل ماضی ہے مگر معنی فعل ماضی والا نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ وضوء کا حکم قیام الی الصلوۃ کے بعد کیلئے ہو، جب کہ وضوء کا حکم قیام الی الصلوۃ سے پہلے کیلئے ہے،، ان طلقھا فلا تحل لہ الایہ، فلا تحل لہ کا حکم ان طلقھا کے بعد ہے، ان دخلت الدار فانت طالق، حکم طلاق دخول دار کے بعد ہے،

دوسری آیت میں اطعمتم ہے یہ بھی اپنے ظاہری معنی پر نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ کھانا کھانے کے درمیان منتشر ہوں، اسی طرح اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا لہ الدعاء“ میں نماز جنازہ پڑھ لینے کے بعد میت کیلئے دعا مانگنے کا حکم ہے دوران نماز جنازہ جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ مراد نہیں، اس کی دلیل فاء تعقیبیہ ہے،

جس طرح مندرجہ بالا آیات میں فاء، تعقیبیہ ہے اسی طرح حدیث مبارک میں بھی فاء، تعقیبیہ ہے ،فاخلصوا لہ الدعاء میں فاء ،تعقیبیہ کا ذکر اور وجود لازمی ہے ،کیونکہ ہر دو آیات اور حدیث میں فاء تعقیبیہ کا مدخول فعل امر ہے پورا جملہ پہلے جملے کی جزا ہے اور اذا کا مدخول جملہ اس کی شرط ہے،،

اذا شرطیہ ہے کیونکہ اس کا مدخول جملہ فعلیہ ہے، علامہ جامی نے فرمایا: اذا الشرطیۃ مختصۃ بالفعلیۃ“ جب اذا شرطیہ ہے اور جملے فعلیے پر داخل ہے تو اذا نے اپنے مدخول جملے کو شرط اور فائے تعقیبیہ کے مدخول جملے کو جزا بنا دیا ہے، اذا کلمات مجازاۃ میں سے ہے، علامہ ابن حاجب نے فرمایا: ”کلم المجازاۃ تدخل علی الفعلین، لسببیۃ الاول ومسببیۃ الثانی “کلمات مجازات دو فعلوں پر داخل ہوتے ہیں، پہلا فعل دوسرے فعل کیلئے سبب بنتا ہے اور سبب بن کر دوسرے فعل کو مسبب بناتا ہے،

حدیث مبارک میں اذا صلیتم علی المیت شرط اور سبب ہے فاخلصوا لہ الدعاء جزا اور مسبب ہے

ان دونوں کے درمیان فاء جزائیہ تعقیبیہ ہے،،

علامہ جامی نے فرمایا: اگر جزا جملہ اسمیہ یا امر ہوتو وہاں فاء تعقیبیہ لائی جائے گی تا کہ معلوم ہو کہ دوسرے جملے کا حکم اور ترتب پہلے جملے کا مرہون منت ہے لیکن اس کے باوجود پہلا جملہ دوسرے جملے کیلئے سبب حقیقی نہ خارج میں ہے نہ ذہن میں،، فرمایا: "ولا یلزم ان یکون الفعل الاول سببا حقیقیا للثانی لا خارجا ولا ذهنا بل ینبغی ان یعتبر المتکلم بینهما نسبة یصح بها ان یوردهما من صورة السبب والمسبب بل الملزوم والازم" یہ لازم نہیں کہ فعل اول، دوسرے فعل کا سبب حقیقی ہو، نہ ذہن میں سبب حقیقی بن سکتا ہے اور نہ خارج میں،،

بلکہ پہلا جملہ ملزوم اور دوسرا جملہ اس کیلئے لازم ہوتا ہے، علامہ جامی کا کلام درج ذیل امور پر مشتمل ہے،

ا: اذا شرطیہ جب امر پر داخل ہوتو جزاء پر فاء کالانا ضروری ہوتا ہے،

۲: یہ فاء فائے تعقیبیہ ہے، جو دلالت کرتی ہے کہ دوسرے فعل (جزا) کا پہلے فعل پر ترتب ہو رہا ہے،

۳: پہلا فعل دوسرے فعل کیلئے خارجا اور ذہنا حقیقی سبب نہیں ہوتا،

۴: پہلا فعل ملزوم اور دوسرا فعل لازم ہوتا ہے لیکن یہ لزوم اعتباری ہے، متکلم کے اعتبار پر موقوف ہے، دوسرے فعل کا تحقق پہلے فعل کے تحقق پر لازمی اور ضروری نہیں بلکہ وجود وعدم کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے،

"اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء"، کے بغیر بھی متحقق ہوسکتا ہے، فاخلصوا له الدعاء"، کا تحقق اذا صلیتم علی المیت، کی نہ جز ہے اور نہ اس میں داخل ہے،،

ان امور کی روشنی میں ثابت اور واضح ہوا کہ حدیث مبارک کا مضمون شرط اور جزاء کی صورت میں ہے، جزاء پر فائے تعقیبیہ داخل ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دوسرے فعل کا تحقق پہلے فعل کے تحقق کے بعد ہوگا، پہلے فعل کے تحقق پر دوسرے فعل کا تحقق حقیقتاً اور حکماً ضروری نہیں

جس سے واضح ہوا کہ اذا صلیتم علی ا لمیت کے تحقق پر فاخلصوا لہ الدعاء کا تحقق نہیں ہو گا بلکہ صلیتم کے بعد فاخلصوا لہ الدعاء کا تحقق ہوگا، شرط ملزوم اور جزا لازم ہے، دونوں کے درمیان نسبت لزوم ہے، یہ نسبت اعتباری ہے متکلم کے اعتبار پر موقوف ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ شرط اور جزاء کا تحقق بیک وقت لازمی اور ضروری نہیں بلکہ ایک کے وقوع کے بعد دوسرے کا وقوع ہوگا،

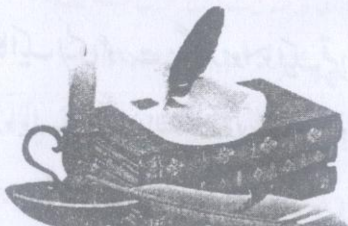
علامہ جامی کی توضیح سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جب شرط اور جزاء کے درمیان فاء تعقیبیہ موجود ہے تو جزاء بطور جز شرط میں داخل نہیں ہوگی، یعنی "فاخلصوا لہ الدعاء"، جو جزاء ہے یہ "اذا صلیتم علی المیت"، میں داخل نہ گی اور اذا صلیتم علی المیت"، کے حصول اور وجود پر اس کا تحقق اور وجود ثابت نہ ہوگا، اس کو "اذا صلیتم علی المیت "ا کے بعد الگ سے کرنا ہوگا، اصول وقواعد کے تحت شرط اور جزا اپنے تحقق، وجود اور حکم کے لحاظ سے دو الگ الگ مضمون ہیں جزا کا دخول اور دونوں کا مقام اور حد میں پایا جانا محال عرفی اور محال اصطلاحی ہے، لہٰذا فاخلصوا لہ الدعاء کو اذا صلیتم کا حصہ اور جز قرار دینا غلط ہے اصول وقواعد اس کی اجازت نہیں دیتے،،

خلاصہ ء بحث یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنا بدعت ہے نہ مکروہ، بدعت اور مکروہ کہنا کوتاہ فہمی اور کم علمی ہے، جن فقہاء کرام نے مکروہ کہا ان کی مراد مکروہ تنزیہہ یعنی خلاف اولیٰ ہے، اور حدیث راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن کہ مقابل بے اثر اور مرجوح ہے"

"حررہ قاضی محمد عظیم فاروقی نقشبندی،،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قبروں پر جانا
احادیث صحیحہ کی روشنی میں



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

قبروں پر جانا احادیث صحیحہ کی روشنی میں

مومنین، مسلمین کا اہل اسلام اور اہل ایمان کی قبور پر جانا جائز بلکہ سنت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے ثابت اور مشروع ہے، بدعت، حرام یا ممنوع ہرگز نہیں، ملاحظہ ہوں احادیث مبارکہ:

ا: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"مر النبی صلی اللہ علیہ و آلہ سلم بامرأة تبکی عند قبر فقال اتقی اللہ و اصبری، قالت الیک عنی فانک لم تصب بمصیبتی و لم تعرفه فقیل لها انه النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فاتت باب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلم تجد عنده بوابین فقالت لم اعرفک، فقال انما الصبر عند الصدمة الاولیٰ" (بخاری، ا، ۱۷۱، زیارة القبور)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ایسی عورت پر گزر ہوا جو ایک قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے خاتون اللہ سے ڈر، اور صبر کر تو اس عورت نے جواب دیا کہ آپ جائیں، آپ اس مصیبت میں مبتلا نہیں ہوئے جس میں میں ہوں، اس خاتون نے آپ کو پہچانا نہیں تھا اس کو بتایا گیا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، بعد میں وہ خاتون بارگاہ رسالتماب میں حاضر ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر کوئی دربان نہ تھا عرض کرنے لگی میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا پھر آپ نے فرمایا صدمہ کے آغاز پر ہی صبر کرنا چاہیے،،

حدیث پاک کے الفاظ اور مضمون واضح ہے وہ خاتون مسلمان تھی، اگر مسلمان نہ ہوتی تو بارگاہ رسلتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوتی نہ معذرت پیش کرتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت کو قبر پر بیٹھے ہوئے اور روتے ہوئے دیکھا اس پر اعتراض فرمایا نہ منع کیا، منع کیا تو صرف رونے سے، اگر قبر پر خاتون کا جانا ممنوع ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور منع فرماتے، آپ کا منع نہ فرمانا اس امر کی دلیل ہے کہ عورت قبر پر جا سکتی ہے،،

۲:حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ہاں تشریف فرماتھے آپ آہستہ سے اٹھ کر جنت البقیع میں تشریف لے گے، وہاں کافی دیر قیام فرمایا ،پھر تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کواٹھایا، (یعنی جنت البقیع والوں کیلئے تین مرتبہ دعافرمائی میں بھی آپ کوتلاش کرتی ہوئی جنت البقیع میں پہنچ گئی،،

آپ کے واپس آنے سے پہلے میں لوٹ آئی، تاریکی کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا سایہ دیکھا، واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ تو نے یہ گمان کیا تھا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیری حق تلفی کریں گے،،

جنت البقیع میں میرے جانے کی وجہ یہ تھی کہ: جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے تھے، انہوں نے اپنا آنا تجھ سے پوشیدہ رکھا تو میں نے بھی پوشیدہ رکھا، جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ آپ کا رب آپ کو حکم دیتا ہے: الفاظ حدیث اس طرح سے ہیں: ''فقال ان ربک یامر کم ان تاتی، اھل البقیع، فتستغفر لھم'' (مسلم، ا، ۳۱۳، ۳۱۴)

یعنی جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا بے شک آپ کا رب آپ کو حکم فرمارہا ہے کہ آپ جنت البقیع میں آئیں اور وہاں مدفون مومنین کیلئے دعائے مغفرت کریں،،

جنت البقیع قبرستان ہے، وہاں مدفون صحابہ کرام ہیں، جو ایمان اور اسلام کی تعبیر، اور تفسیر ہیں،، لیکن پھر بھی اللہ وحدہ لاشریک ان کی قبور پر آنے اور ان کیلئے استغفار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس حدیث سے روز روشن کی طرح واضح اور ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی قبور پر آنا، ان کیلئے دعائے مغفرت کرنا اللہ وحدہ لاشریک کا حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے،،

۳:حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ جب میں جنت البقیع کے قبرستان میں جاؤں تو: ''کیف اقول لھم یارسول اللہ قال قولی السلام علی اھل الدیار من المومنین والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین وانا ان شاء اللہ بکم للاحقون'' (مسلم، ا، ۳۱۴)

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کہوں؟ فرمایا تم کہنا جو مومنین اور مسلمین اس قبرستان میں موجود اور مدفون ہیں ان پر میری طرف سے سلام ہے، اور جو مومنین ہم میں سے، ہم سے پہلے اس دنیا سے چلے گئے ہیں، اور جو ہمارے اس دنیا سے جانے کے بعد رخصت ہونگے سب پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور بے شک ہم بہت جلد تم میں ملنے والے ہیں،،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعائے سلامت اور دعائے رحمت کی تعلیم فرمائی، اور اہل بقیع کو مخاطب کر کے یہ دعا کرنے کا بھی حکم فرمایا، اگر خواتین کیلئے قبرستان میں جانا اور دعا کرنا ممنوع ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جانے دیتے نہ اہل بقیع کو بصورت خطاب سلام کہنے کا ارشاد فرماتے:

۴: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "قال استاذنت ربی ان استغفر لامی فلم یاذن لی و استاذنته ان ازور قبرها فاذن لی" دوسری روایت میں ہے: "فزورو القبور فانها تذکر الموت" (مسلم، ۱، ۳۱۴)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کیلئے استغفار کرنی اجازت چاہی لیکن مجھے اجازت نہ ملی، اور میں نے والدہ کی قبر کی زیارت کرنیکی اجازت چاہی، مجھے اجازت دی گئی، پس تم قبرستان میں جایا کرو، کیونکہ زیارت قبور موت کی یاد تازہ کرتی ہے،،

یہاں تفصیل کی گنجائش ہے نہ مراد،،

یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ قبور کی زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے آپ نے زیارت قبور کے فوائد بھی بیان فرمائے ہیں،

قبور کی زیارت مومن کے دل و دماغ میں ایک سوچ پیدا کرتی ہے، یوم آخرت کا تحقق اور تعین موت کا احساس اور مشاہدہ پیدا ہوتا ہے،،

۵: ابن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کنت

نهیتکم عن زیارت القبور فزوروها الحدیث، (مسلم، ۱، ۳۱۴)

اس سے قبل میں نے تم کو قبروں پر جانے سے منع کر رکھا تھا اب تم قبروں پر جاؤ،،

۶: عن بریدة قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعلمهم اذا خرجوا الی المقابر السلام علیکم اهل الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم للاحقون نسئل اللہ لنا ولکم العافیة" (مسلم، ۱، ۳۱۴)

ترجمہ: بریدہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو یہ تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب وہ قبرستان کی طرف نکلیں تو کہیں السلام علیکم اہل الدیار من المومنین والمسلمین اور بے شک ہم اللہ کے چاہنے سے تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کا سوال کرتے ہیں،

معلوم ہوا قبور پر جانا صحابہ کرام کا عمل ہے اس عمل کی تکمیل اور افادیت کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ دعا کی تعلیم دی اور یہ واضح فرمایا کہ جس طرح مرے ہوئے مومنین اور مسلمین کیلئے دعا مغفرت مفید اور موثر ہے بالکل اسی طرح زندہ دعا انسان کیلئے بھی مفید اور ذریعہ عافیت ہے،

۷: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

"مر النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقبور بالمدینة فاقبل علیهم بوجهه فقال السلام علیکم یا اهل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر رواه الترمذی '۳۲۹)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کے ایک قبرستان سے گزرے آپ نے اس کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا اے اہل قبور تم پر سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے، تم ہم سے پہلے فوت ہوئے ہو، اور ہم تمہارے بعد آنے والے ہیں،

اس حدیث سے بطور خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اہل قبور کی طرف متوجہ ہونا اور بطور تخاطب سلام پیش کرنا اپنے اور اہل قبور کی بخشش کیلئے بارگاہ خداوندی میں دعائے مغفرت کرنا ثابت ہے یہ

اس بات کی قوی دلیل ہے کہ قبور پر جانا دعائے مغفرت کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت فعلی ہے ،بدعت یا ممنوع نہیں،،

۸: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قد کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فقد اذن لمحمدفی زیارۃ قبر امه فزوروھا فانھا تذکر الاخرۃ" (ترمذی: ۳۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں نے قبروں پر جانے سے تمہیں منع کر دیا تھا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی والدہ کی قبر پر جانے کی اجازت دے دی گئی ہے پس تم بھی قبروں پر جاؤ، کیونکہ قبروں پر جانا آخرت کی یاد دلاتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب سے اپنی والدہ کی قبر پر جانے کی اجازت طلب کی، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اجازت مرحمت فرمائی، اس اجازت کو دلیل اور ثبوت کے طور پر صحابہ کرام علیہم الرضوان اور مسلمانوں کو مومنین کی قبور پر جانے کی اجازت عطا فرمائی اور ساتھ ہی قبروں پر جانے کا فائدہ اور حکمت بھی ارشاد فرمائی کہ زیارت قبور سے موت کے وجود اور صدور کا یقینی علم حاصل ہوتا ہے، اور یوم آخرت کے قیام اور جزا و سزا پر ایمان پختہ ہوتا ہے،

۹: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زوروا القبور فانھا تذکر کم الاخرۃ" (ابن ماجہ، ۱۱۲)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قبروں پر جایا کرو، قبروں پر جانا آخرت کو یاد دلاتا ہے، یعنی جب تم قبروں پر جاؤ گے تو مرنے کا تصور اجاگر ہوگا، اور یہ باور ہوگا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی اور قیامت کے دن اللہ وحدہ لاشریک کے حضور پیش ہو کر اعمال کا حساب دینا ہوگا، اور پھر جزا و سزا کے عمل سے گزرنا ہوگا،

۱۰: ابن ابی ملیکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ:" ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رخص فی زیارۃ القبور" (ابن ماجہ، ۱۱۲)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے،

۱۱: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تذھد فی الدنیا وتذکر الاخرۃ" (ابن ماجہ، ۱۱۲، ۱۱۳)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں پر جانے سے منع کر کھا تھا ،اب تم قبروں پر جاؤ، کیونکہ قبروں پر جانے سے دنیا میں زہد وتقوی پیدا ہوتا ے اور آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے،،

احادیث ،۸، تا۱۱، سے واضح ہوا کہ ابتدائے اسلام میں قبروں پر جانے کی ممانعت تھی لیکن بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود حکم فرمایا اور قبروں پر جانے کے فوائد بیان فرمائے ، کہ دنیاوی زندگی کو زہد وتقوی سے مزین اور معمور کرنے کا ذریعہ زیارت قبور ہے، قیامت کے آنے اللہ وحدہ لاشریک کی بارگاہ احدیت میں حاضری اعمال کی جانچ پڑتال ،اور قانون جزاوسزا سے گزرنے کا رجحان اور خیال بھی زیارت قبور سے پیدا ہوتا ہے،، اگر قبروں پر جانے کی ممانعت کا حکم قائم اور دائم رہتا تو فزوروفانھا تذھد فی الدنیا وتذکر الاخرۃ، کا فوائد وثمرات بھرا حکم کیوں فرمایا جاتا؟

ایک معارضہ اور اس کا جواب: معارضہ یہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

"ان سول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لعن زوارات القبور" (ترمذی، ۳۲۹)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبور پر جانے والیوں پر لعنت فرمائی ہے یہ حدیث مرفوع ہے، اگر پہلی احادیث پر عمل کیا جائے تو اس حدیث پر عمل نہیں ہوسکتا، یہ تعارض ہے مرفوع حدیث ممانعت میں ہے اس کا ترک جائز نہیں،،

جواب یہ ہے کہ بے شک حدیث ممانعت بدرجہ رفع ہے مگر یہ حدیث منسوخ ہے اور اس کی ناسخہ احادیث ،۸ تا ۱۱ ہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا:" وقد رای بعض اهل العلم ان هذا كان قبل ان يرخص النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم في زيارة القبور فلما رخص دخل في رخصة الرجال والنساء" محدثین فرماتے ہیں کہ یہ حکم کہ قبروں پر جانے والیوں پر لعنت ہے، قبروں پر جانے کی اجازت دینے سے قبل تھا،،

جب اجازت مرحمت فرمائی تو مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی اجازت مل گئی،،

دوسرا جواب یہ نقل فرمایا کہ:" وقال بعضهم انما كره زيارة القبور في النساء لقلة صبر هن وكثرة جزعهن" (ترمذی، ۳۲۹)

کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے صرف عورتوں کا قبروں پر جانے کو ناپسند فرمایا، کیونکہ عورتوں میں صبر کم اور آہ وبکاء زیادہ ہوتا ہے، لیکن جب اجازت دی تو عورتوں اور مردوں دونوں کو اس میں شامل فرمایا، ثابت ہوا کہ قبروں پر جانا عورتوں کیلئے ممنوع نہیں بلکہ جائز اور مشروع ہے، اور یہ جوازیت اور مشروعیت جس طرح مردوں کیلئے ہے اسی طرح عورتوں کیلئے بھی ہے،،

۱۲: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:" كنت ادخل بيتي الذی فيه رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وانی واضع ثوبی، واقول انما هو زوجی وابی فلما دفن عمر معهم، فوالله ما دخلته الا وانا مشدودة علی ثيابی حياء من عمر رواه احمد، مشكوة، ۱۵۴"

میں اپنے گھر (حجرہ) جس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہیں، داخل ہوتی تو اپنے معمول کے پردہ میں ہوتی اور یہ کہتی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میرے شوہر نامدار ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے ابو ہیں لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں دفن ہوئے تو قسم بخدا میں جب داخل ہوتی تو اپنے آپ کو کپڑوں میں ڈھانپ لیتی (مکمل پردہ میں ہوتی) عمر (رضی اللہ عنہ) سے شرم وحیاء کی وجہ سے،،

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا روضہء رسول میں داخل ہونا اور بار، بار آنا جانا اس بات کی دلیل اور اس امر کا جواز اور جواب ہے کہ زیارت قبور ممنوع نہیں بلکہ سنت ہے،،

۱۳: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ ایک سیاہ رنگ کا مرد، یا سیاہ رنگ کی عورت مسجد نبوی میں رہ کر مسجد کی خدمت کرتا، یا کرتی تھی وہ فوت ہوگئی، یا وہ فوت ہوگیا، صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتائے بغیر نماز جنازہ پڑھ کر دفنا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا کہ وہ کہاں ہے؟ صحابہ کرام نے اس سے متعلقہ سارا واقعہ بیان کیا، اور اس کو اس قابل نہ سمجھا کہ اس کی موت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دیجائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دلونی علی قبرہ قال فاتی قبرہ فصلی علیہ'' (بخاری، ۱، ۱۷۸)

مجھے اس کی قبر بتاؤ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی قبر پر تشریف لائے اور قبر پر ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی،،،

۱۴: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایک ایسی قبر پر ہوا، جو باقی قبروں سے ہٹ کر اکیلی ایک کونے میں تھی ،''فامھم وصلوا خلفہ'' (بخاری، ۱، ۱۷۸)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قبر پر صاحب قبر کی نماز جنازہ پڑھائی اور صحابہ کرام نے آپ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی، اس حدیث نے واضح کر دیا کہ قبروں پر جانا منوع نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی سنت ہے،، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی مومن کی میت نماز جنازہ پڑھے بغیر دفنا دی گئی ہو تو تین دن تک اس کی قبر پر اس کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے،

۱۵: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث بخاری میں امام مسلم رحمہ اللہ نے یہ الفاظ بھی بیان فرمائے ہیں، ''ثم قال ان هذه القبور ملوة ظلمة علی اهلها وان الله ینور ها لهم لصلوتی علیهم'' (مسلم، ۱، ۳۱۰)

نماز جنازہ پڑھانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ قبریں، قبروں والوں پر تاریکی سے بھرپور

تھیں (یعنی یہ سب قبریں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں مدفون لوگ قبروں کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے) میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ میری نماز کی وجہ سے ان کیلئے ان کی قبروں کو نور سے معمور فرمائے گا،،

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی اندرونی تاریک حالت اور سیاہ کیفیت کو ملاحظہ فرمایا اور صحابہ کرام کو خبر دی، پھر جو نماز جنازہ پڑھائی اور مستقبل میں مرتب ہونے والے اس کے فوائد اور ثمرات کی بھی خبر دی کہ میری نماز کی بدولت اللہ تعالیٰ قبروں کے اندھیروں کو دور فرما کر ان کے اندر نور کا اجالا فرمائے گا، یہ حدیث اس بات پر بھی دال ہے کہ قبروں پر جا کر دعائے مغفرت کرنے سے اہل قبور کو فائدہ ہوتا ہے،،

۱۶: امام بیہقی نے محمد بن النعمان سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "من زار قبر ابویہ او احدھما فی کل جمعة غفر له و کتب برا رواہ البھیقی فی شعب الایمان مرسلا" (مشکوۃ، ۱۵۴)

جو شخص ہر جمعہ کو والدین یا ان میں سے کسی ایک کی قبر پر جائے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے، اور اس کا فرماں بردار ہونا بھی لکھ دیتا ہے،، امام بیہقی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے، ہر دو اعتبار سے حجت اور دلیل ہے اس حدیث میں ہر جمعہ کو والدین یا کسی ایک کی قبر پر جانے کی ترغیب اور تحریص دلائی گئی ہے اور جانے والے کیلئے مغفرت اور فرماں برداری کی بشارت بھی دی گئی ہے یہ انعامات اور ثوابات صرف اس لئے ہیں کہ قبور پر جانا ممنوع نہیں بلکہ مغفرت اطاعت و تابعداری کا موجب اور ذریعہ ہے،،

۱۷: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایسی دو قبروں کے پاس سے ہوا جن کے مردوں کو عذاب ہو رہا تھا بعد از مشاہدہ اور ملاحظہ فرمایا: "وما یعذبان فی کبیر اما احدھما فکان لا یستتر من البول و اما الاخر فکان یمشی بالنمیمة

،ثم اخذ جریدة رطبة فشقها بنصفین ،ثم غرز فی کل قبر واحدة فقالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم لم صنعت ھذا فقال لعله ان یخفف عنهما مالم ییبسا" (بخاری،ا،۱۸۲)

ترجمہ: ان قبروں والوں کو کسی بڑے گناہ (شرک، وکفر) کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا، ان میں سے ایک پیشاب کرتے وقت ستر نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغل خوری کیا کرتا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہری، سبز شاخ لی، اس کو چیر کر اس کے نصف نصف دو حصے بنائے، ایک حصہ ایک قبر میں اور دوسرا حصہ دوسری قبر میں گاڑھ دیا، صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ اس طرح آپ نے کیوں فرمایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، یقیناً ان کے خشک ہونے تک عذاب میں تخفیف رہے گی،،

یہ حدیث ببانگ دہل بتا رہی ہے کہ اہل ایمان کی قبور پر جانا، بخشش اور تخفیف عذاب کیلئے زبانی یا فعلی اقدامات کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل خیر کو بنیاد بناتے ہوئے

:"اوصی بریدة الاسلمی ان یجعل فی قبرہ جریدھان" (بخاری،ا،۱۸۱)

- بریدہ الاسلمی رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی قبر میں دو شاخیں ہری گاڑی جائیں خشک ہونے تک ذکر الٰہی کرتی رہینگی اور مجھے قبر میں فائدہ ہوگا،،

۱۸: "اقراء یسین علی موتاکم" (نسائی، ابن ماجہ) اپنے مردوں پر سورۂ یاسین پڑھو،،

علامہ بدرالدین العینی نے فرمایا: "فالحدیث یدل علی ان المیت ینتفع بقراءة القرآن عندہ"

ترجمہ: میت کے پاس قرآن پڑھنے سے اس کو فائدہ ہوتا ہے، یہ حدیث اس پر دلیل صریح ہے،،

مزید فرمایا: "اذاجتمعوا عندہ لقراءة القرآن والذکر فان المیت ینتفع به" (العینی،۸،۱۸۶)

میت کے پاس جب لوگ قرآن پڑھنے اور ذکر اللہ کرنے کی غرض سے جمع ہوں اور ذکر وتلاوت کریں تو بلاشبہ میت کو اس سے فائدہ ہوتا ہے، اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے ،قبور پر جانا اور میت کے فائدے کیلئے اقدامات کرنا ممنوع کیسے ہے؟

۱۹: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قبر کے

پاس سے گزرے جس میں صاحب قبر کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو کب دفن کیا گیا ہے؟

صحابہ نے عرض کیا آج رات کو فرمایا مجھے کیوں نہیں بتایا؟ رات کو ہی دفن کر دیا آپ کو بیدار کرنا ہم نے نامناسب سمجھا "فقام فصففنا خلفه قال ابن عباس و انا فيهم فصلى عليه"

آپ ﷺ قبر پر کھڑے ہوئے، اور ہم نے آپ کے پیچھے صفیں بنائیں، آپ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور میں بھی ان نماز پڑھنے والوں میں تھا، دوسری روایت میں ہے، "عن ابن عباس قال اتى رسول الله قبرا" (بخاری، ۱، ۱۷۷)

کہ آپ ﷺ قبر پر تشریف لائے اور اس میت کی نماز جنازہ پڑھائی،،

۲۰: امام بخاری نے عقبہ بن عامر سے مروی یہ حدیث نقل کی ہے: "ان النبی ﷺ خرج یوما فصلى على اهل احد صلوته على الميت الحديث" (بخاری، ۱، ۱۷۹)

بے شک نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے بعد ایک دن شہداء احد کی قبور پر تشریف لے گئے اور ان پر نماز جنازہ پڑھی، جس طرح میت کی پڑھی جاتی ہے،،

علامہ عینی نے فرمایا: "روى البخارى عن عقبه بن عامر انه ﷺ صلى على قتلى احد بعد ثمان سنين" (العینی، ۸، ۱۲۲) یہ نماز شہادت کے آٹھ سال بعد پڑھی تھی،،

مندرجہ ان احادیث سے ثابت ہوا کہ قبور پر جانا، ان کیلئے بخشش کا ساماں کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، قبور پر جانے سے روکنا اور ممانعت کا فتوی دینا کج فہمی اور جہالت ہے،، (اعاذنا اللہ منها)

نوٹ:

قبر پر جانے والے آدمی کیلئے لازم ہے کہ قبر سے دور رہے، قبر کو چھونا، چومنا ممنوع ہے البتہ والدین کی قبر کو بوسہ دیا جا سکتا ہے،" وقال بعض العلماء لا بأس بتقبيل قبر الوالدين" (مرقات، ۴، ۱۱۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمعرات کو
روحوں کا اپنے گھر آنا



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

جمعرات کو روحوں کا اپنے گھر آنا

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مومن کی روح زمین کے برزخ میں ہے، وہ جہاں جانا چاہے جا سکتی ہے، جمعرات کو اپنے دنیاوی گھر میں آتی ہے، اس پر مندرجہ ذیل احادیث ہیں، جن کو نامور محدثین نے نقل فرمایا ہے:

۱: اخرج ابن المبارک فی الذهد، و الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول و ابن ابی الدنیا و ابن منده عن سعید بن المسیب عن سلیمان، قال ان ارواح المومنین من الارض تذهب حیث شاءت و نفس الکافر فی سجین"

ترجمہ: ابن المبارک نے "الزہد" اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابن ابی الدنیا اور ابن مندہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ مومن کی روح برزخ یعنی زمین میں ہوتی ہے، اور وہ جہاں جانا چاہے جاتی ہے اور کافر کی روح سجین میں ہوتی ہے،،

۲: و اخرج الحکیم الترمذی، عن سلمان: قال ان ارواح المومنین تذهب فی برزخ من الارض حیث شاءت بین السماء الارض"

ترجمہ: حکیم ترمذی سلمان سے نقل فرماتے ہیں: کہ انہوں نے فرمایا مومنین کی روحیں زمین میں (برزخ) ہوتی ہیں، وہ زمین اور آسمان کے درمیان جہاں چاہیں جاتی ہیں،،

۳: و اخرج ابن ابی الدنیا عن مالک بن انس، قال بلغنی ان ارواح المومنین مرسلة تذهب حیث شاءت"

ترجمہ: ابن ابی الدنیا مالک بن انس سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ بے شک مومنین کی روحین آزاد ہیں وہ جہان چاہیں جاتی ہیں،،

۴: قال ابن جریر فی تفسیرہ: حدثنا محمد بن عوف الطائی، حدثنا ابو المغیرۃ حدثنا

صفوان ،قال سئلت عامر بن، عبد اللہ بالیمن ھل لانفس المومنین مجتمع ؟فقال الی الارض یقول اللہ تعالیٰ ولقد کتبنا فی الزبور من بعدالذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون، قال ھی الارض التی تجتمع الیھا ارواح المومنین حتی یکون البعث“

محدث ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ صفوان نے یمن میں عامر بن عبداللہ سے پوچھا کہ مومنین کی روحیں کہاں جمع ہوتی ہیں؟ فرمایا زمین میں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے !ہم نے زبور میں یہ ذکر کیا ہے کہ میری زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے،

(شرح الصدور، ص، ۲۲۶، تا ۲۲۸، مطبوعہ بیروت)

یہ جملہ احادیث اس بات کا ثبوت ہیں کہ مومن کی روح آزاد ہے جو جہاں چاہے جاسکتی ہے اور ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مومنین کی ارواح کا ٹھکانہ زمیں اور برزخ ہے، زمین اور آسمان کے درمیان جہاں چاہیں جاسکتی ہیں،،

شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا: مستحب است کہ تصدق کردہ شود ازمیت بعد از رفتن اواز عالم ہفت روز، وتصدق ازمیت نفع میکند اورا،، بے خلاف میان اہل علم، ووارد شدہ است دراں احادیث صحیحہ خصوصاو بعضے از علماء گفتہ اند کہ نمے رسد بہ میت مگر صدقہ ودعا ودر بعضے روایات آمدہ است کہ روح میت مے آید خانہ ء خود را شب جمعہ، پس نظر میکند کہ تصدق میکند ازوے یانہ؟ (اشعۃ اللمعات، جلد، اول، ص، ۷۱۷)

ترجمہ: میت کے دنیا سے چلے جانے کے بعد سات دن تک میت کی طرف سے صدقہ کرنا مستحب ہے یہ صدقہ میت کیلئے مفید ہے، اس میں کسی بھی اہل علم کا اختلاف نہیں، اس صدقہ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، بعض علماء نے فرمایا ہے کہ میت کو صدقہ اور دعائے مغفرت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پہنچتی، بعض روایات (احادیث) میں آیا ہے کہ جمعرات کو میت کی روح اپنے دنیاوی گھر آتی ہے اور دیکھتی ہے کہ گھر والوں نے اس کی طرف

سے صدقہ کیا ہے یا کہ نہیں،

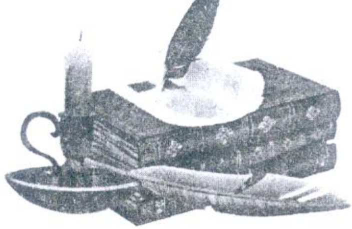
اسی لئے جمعرات کو میت کے گھر والے، میت کی سہولت اور بہتری کیلئے اچھی چیز پکا کر اس پر دعا مانگتے ہیں اور وہ چیز کسی مستحق کو دے دیتے ہیں، یہ ناجائز اور بدعت نہیں احادیث اور روایات سے اس کا ثبوت موجود ہے،، واللہ اعلم

قاضی محمد عظیم نقشبندی

۱۱ دسمبر ۲۰۱۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تہبند اور شلوار کو غرور اور تکبر کی بناء پر ٹخنوں سے نیچے رکھنا



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تہبند اور شلوار کو غرور اور تکبر کی بناء پر ٹخنوں سے نیچے رکھنا

تہبند اور شلوار کو غرور اور تکبر کی بناء پر ٹخنوں سے نیچے رکھنا، اور زمین پر گھسیٹنا ممنوع اور حرام ہے ، دوزخی ہونے کا سبب ہے، محدثین نے اس کے متعلق احادیث مبارکہ جمع فرما کر اس مسئلہ کو واضح فرمایا ہے چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے "ما اسفل من الکعبین ففی النار" باب باندھ کر درج ذیل احادیث نقل فرمائی ہیں:

۱: عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، قال لا ینظر الله یوم القیامة الی من جر ازاره بطرا" (بخاری، جلد ثانی، ص، ۸۶۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص پر نظر رحمت نہیں ڈالے گا جو اپنا تہبند تکبر کی بناء پر زمین پر گھسیٹے گا،،

۲: عن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار" (بخاری جلد ثانی، ص، ۸۶۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، جو تہبند ٹخنوں سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے،

۳: "عن عبد الله بن عمر یقول قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من جر ثوبه من مخیلة لم ینظر الله الیه یوم القیامة" (بخاری، ایضا)

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا، زمین پر گھسیٹتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں ڈالے گا،،

۴: "عن ابن عمر ان رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال لا ینظر الله تعالی من جر ثوبه خیلاء" (مسلم ۲، ۱۹۴)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو اپنا کپڑا، (تہبند وغیرہ) تکبر کی وجہ سے زمین پر گھسیٹتا ہے،،

۵: ”عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ان الذی یجر ثیابہ من الخیلاء لا ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ“ (مسلم، ۲، ۱۹۴)

عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، بلاشبہ وہ شخص جو اپنے کپڑے غرور، تکبر کی بناء پر زین پر گھسیٹتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا،،

۶: عن ابن عمر فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باذنی ھاتین یقول من جر ازارہ لا یرید بذالک الا المخیلۃ فان اللہ لا ینظر الیہ یوم القیامۃ“ (مسلم، ۲، ۱۹۴)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے ان دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اپنا تہبند تکبر اور غرور کی وجہ سے زمین پر گھسیٹے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا،،

۷: ابی سعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”من جر ازارہ من الخیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ“ (ابن ماجہ، ۲۵۵)

جو شخص اپنا تہبند تکبر کی وجہ سے زمین پر گھسیٹے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا

۸: ”عن حذیفۃ قال اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باسفل عضلۃ ساقیہ او ساقہ فقال ھذا موضع الازار، فان ابیت فاسفل، فان ابیت فلا حق الازار فی الکعبین“ (ایضاً)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پنڈلیوں کے نیچے والا حصہ

(سخت جگہ، پٹھا) پکڑا اور یہ فرمایا یہ جگہ تہبند کی ہے اگر اس کو تسلیم نہ کرو تو اس سے نیچے والی جگہ ،اگر وہ بھی پسند نہ ہو تو اس سے نیچے والی جگہ، اگر وہ بھی تسلیم نہ ہو تو پھر ٹخنوں میں تہبند کا کوئی حق نہیں، یعنی تہبند سے ٹخنوں کو ڈھانپا ہوا نہیں ہونا چاہیے،،

۹: العلاء بن عبدالرحمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: ”قلت لابی سعید هل سمعت من رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم شيئا فی الازار قال نعم سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول ازرة المومن الى انصاف ساقيه لاجناح عليه مابينه وبين الكعبين وما اسفل من الكعبين فی النار يقول ثلثا لا ينظر الله الى من جر ازاره بطرا“ (ایضاً)۔

کہ میں نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ نے تہبند باندھنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی ارشاد سماعت کیا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں سنا ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن کے تہبند کی جگہ پنڈلیوں کا نصف ہے، اگر پنڈلیوں کے نصف اور ٹخنوں کے درمیان ہو جائے تو بھی حرج نہیں، ٹخنوں سے نیچے جو تہبند ہے وہ آگ میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا تکبر کی وجہ سے جو اپنا تہبند زمین پر گھسیٹے گا قیامت کے دن اللہ اس کو نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا،،

۱۱: ابوداؤد نے روایت کیا: ”وارفع ازارک فی نصف الساق فان ابيت فالى الكعبين“ (ص، ۲۱۰)

اپنے تہبند کو نصف پنڈلی تک اٹھاؤ، رکھو، اگر یہ گوارا نہ ہو تو ٹخنوں تک،،

۱۲: ”عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من جر ثوبه او قال ان الذی يجر ثوبه من الخيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة“ (نسائی، ۲، ص، ۲۹۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! جو شخص اپنا کپڑا زمین پر گھسیٹے یا یہ فرمایا کہ بے شک جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹے قیامت کے دن اللہ اس کی

طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا،

۱۳: ’’عن ابن عمر قال، قال رسول الله ﷺ من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة‘‘ (ترمذی، ۱، ۶۳۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص تکبر کی بناء پر اپنا کپڑا، تہبند زمین پر گھسیٹے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا،،

۱۴: ’’عن حذيفة قال، قال رسول الله ﷺ موضع الازار الى انصاف الساقين والعفيلة، فان ابيت فاسفل، فان ابيت فمن وراء الساق ولا حق للكعبين فى الازار واللفظ لمحمد‘‘ (نسائی، ۲، ص، ۲۹۸)

حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تہبند کی جگہ پنڈلی کا نصف اور سخت پٹھہ ہے (جو ٹخنے سے اوپر ہے) اگر یہ گوارا نہ ہو تو سخت پٹھہ سے نیچے، ٹخنوں کا تہبند ئیں کوئی حق نہیں،،

۱۵: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’ما اسفل من الكعبين من الازار ففى النار‘ (نسائی، ۲، ص، ۲۹۸)

ٹخنوں سے جو تہبند نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے،،

۱۷: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’ان الله عزوجل لا ينظر الى مسبل الازار‘‘ (نسائی، ۲، ص، ۲۹۸)

بے شک اللہ تعالیٰ تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والے کو نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا،،

۱۸: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ’’الا سبال فى الازار، والقميص، والعمامة من جر منها شيئا خيلاء لا ينظر الله اليه يوم القيامة‘‘ (نسائی، ۲، ص، ۲۹۸)

اسبال (لٹکانا، لمبا رکھنا) تہبند، قمیص اور عمامہ میں ہے، جو شخص ان تین میں سے کسی ایک کو تکبر کی

وجہ سے لٹکائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو نظر رحمت سے نہیں نوازے گا،،

۱۹: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! "من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة، فقال ابو بكر ان احد جانبي ازاري يسترخي اني لا تعاهد ذالک منها قال لست ممن يفعله خيلآء" (سنن ابوداؤد، ۲، ۲۱۰)

جو شخص اپنا کپڑا تکبر کی بناء پر زمین پر گھسیٹے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں ڈالے گا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میرے تہبند کی ایک طرف لٹکی رہتی ہے، میں سعی بسیار کے باوجود اس کی حفاظت نہیں کرسکتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کی بناء پر تہبند لٹکاتے ہیں احادیث مذکورہ بالا اس بات پر واضح ثبوت اور دلیل ہیں کہ:

۱: تکبر اور غرور کی بناء پر تہبند اور شلوار کو اتنا نیچے لٹکانا کہ وہ زمین پر گھسیٹنے لگے، ممنوع، حرام ہے اور دوزخ میں جانے کا سبب ہے یعنی ایڑیوں کے نیچے آتا ہو، اور زمین پر گھسیٹتا اور پھیلتا ہو،،

۲: شلوار اور تہبند کو ٹخنوں تک رکھا جاسکتا ہے اس کیلئے کوئی ممانعت نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے، ٹخنوں تک شلوار اور پاجامہ کو رکھنے سے منع کرنا، حرام اور ممنوع کہنا جہالت، کج فہمی اور احادیث مبارکہ سے واضح لاعلمی اور بغاوت ہے،

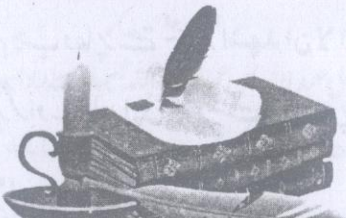
۳: پنڈلی تک شلوار اور تہبند، پاجامہ رکھنے پر زور دینا، اور سنت قرار دینا غلط اور سینہ زوری ہے اور فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہے،

۴: پنڈلی تک شلوار، تہبند اور پاجامہ رکھنے کی عادت بنالینا ایک مخصوص گروہ اور فرقہ کی علامت ہے جن کا عقیدہ ہے کہ ان کے معمولات کے علاوہ تمام عقائد اور معمولات نعوذ باللہ باطل ہیں، ان عقائد اور معمولات کے عاملین اور قائلین مشرک اور واجب القتل ہیں، اللہ تعالیٰ احادیث مبارکہ کی منشاء کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، امین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشہد میں اشارہ کرنا سنت ہے

انگلی کا تحرک نہیں



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

تشہد میں اشارہ کرنا سنت ہے، انگلی کا تحرک نہیں،

حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب آپ نماز میں یعنی تشہد میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھتے، "واشار باصبعه واتبعها بصره ثم قال، قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لهی اشد علی الشيطن من الحديد يعنى السبابة رواه احمد" اور اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ فرماتے، اور اپنی آنکھوں کو اس پر مرکوز رکھتے، اور فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سبابہ (شہادت کی انگلی) سے اشارہ کرنا شیطان کیلئے لوہے کی گرز سے زیادہ سخت ہے،

۲: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "كان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يشير باصبعه اذادعا ولا يحركها رواه ابوداؤد، ونسائى، وزاد ابوداؤد ولا يجاوز بصره اشارته" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دعا پڑھتے یعنی (اشهد ان لا اله الا الله، تو لا الہ پر انگشت شہادت اٹھاتے اور الا اللہ پر گرا دیتے اور اپنی نظر انگشت شہادت پر مرکوز رکھتے انگشت مبارک کو حرکت میں نہیں لاتے تھے،،

۳: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشہد میں "رفع اصبعه اليمنى التى تلى الابهام يدعو بها رواه مسلم" اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی جو انگوٹھے کے قریب ہے اٹھائی اور اس سے اشارہ فرمایا،،

۴: مالک بن نمیر الخزاعی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ "رأيت النبى صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واضعا يده اليمنى على فخذه اليمنى فى الصلوة ويشير باصبعه" (ابن ماجہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے نماز میں دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھا اور انگلی سے اشارہ فرما رہے تھے،،

۵: وائل بن حجر سے مروی ہے کہ: "رأیت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قد حلق الابھام والوسطی ورفع التی تلیھما یدعو بھا فی التشھد" (ابن ماجہ)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے انگوٹھے اور درمیانی انگلی کا حلقہ بنایا اور دونوں کے ساتھ والی انگلی کو اٹھایا اور تشہد میں اشارہ فرمارہے تھے،،

۶: حضرت نافع، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: "ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان اذا جلس فی الصلوۃ وضع یدیہ علی رکبتیہ ورفع اصبعہ الیمنی التی تلی الابھام فیدعو بھا والیسری علی رکبتہ باسطا علیھا" (ابن ماجہ)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھتے اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کو اٹھاتے. اور اس کے ساتھ اشارہ فرماتے، جبکہ بایاں ہاتھ بائیں ران پر بچھائے ہوئے ہوتے،،

۷: علی بن عبدالرحمن المعاوی، کی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: "اذا جلس فی الصلوۃ، وضع کفہ الیمنی علی فخذہ الیمنی وقبض اصابعہ کلھا واشار باصبعہ التی تلی الابھام ووضع کفہ الیسری علی فخذہ الیسری" (ابوداؤد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور ساری انگلیوں کو اکٹھا فرماتے اور انگوٹھے کے متصل انگلی سے اشارہ فرماتے، بائیں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے،،

۸: حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ذکر کیا کہ: "ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یشیر باصبعہ اذا دعا ولا یحرکھا" (ابوداؤد)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی انگلی سے اشارہ فرمایا کرتے جب شہادت کے کلمات ادا فرماتے، انگلی کو حرکت میں نہیں لاتے تھے،،

۹: عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا قعد فی

الصلوة جعل قدمه اليسرى تحت فخذه اليمنى وساقه وفرش قدمه اليمنى على فخذه اليمنى واشار باصبعه" (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشہد میں بیٹھتے تو بایاں قدم دایاں ران اور پنڈلی کے نیچے کر دیتے ،دایاں پاؤں بچھاتے ،اپنا بایاں ہاتھ بائیں ران پر،اور دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے ،اور انگلی سے اشارہ فرماتے ،اور وہ سبابہ ہوتی،،

۱۰:نمیر الخزاعی کے والد بیان کرتے ہیں:" رأیت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واضعا ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى رافعا اصبعه السبابة" (ابوداؤد)

کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے اپنا دایاں بازو دائیں ران پر رکھا ہوا تھا اور آپ اپنی سبابہ (شہادت) کی انگلی کو اٹھائے ہوئے تھے،،

۱۱:ابوحمید ساعدی نے صحابہ سے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت نماز کا تم سے زیادہ عالم ہوں، پھر پوری نماز پڑھی اور آخر میں:" اشار باصبعه یعنی السبابة" (ترمذی)

سبابہ یعنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا،،

۱۲:امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن اور صحیح ہے،، صحابہ اور تابعین کا مختار اشارہ کرنا ہے، انگلی کو متحرک کرنا نہیں صحاح ستہ کی منقولہ، مذکورہ جملہ احادیث مرفوعہ جو اس بات کا ثبوت اور دلیل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اشارہ کرنا ہے انگلی کا تحرک نہیں،،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

داڑھی ایک قبضہ (مٹھ)
رکھنا سنت ہے



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

داڑھی ایک قبضہ (مٹھ) رکھنا سنت ہے

داڑھی صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش انبیائے کرام کی سنت ہے، داڑھی کے متعلق حدیث پاک میں ہے ''من سنن لمرسلین یہ تمام انبیائے کرام کی سنت ہے،

حضرت ہاروں علیہ السلام کی داڑھی کا ذکر بالفاظ صریحہ قرآن مجید میں موجود ہے، ''یا ابن ام لا تأخذبلحیتی ولا برأسی'' عرب میں ملت ابراہیمی کے پیروکار داڑھی رکھتے تھے، اور اکثر مشرکین داڑھی منڈاتے تھے،

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! ''خالفوا المشرکین وفروا اللحی واحفوا الشوارب'' (بخاری، ۲، ۸۷۵)

مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو کٹاؤ یعنی پست کرو''

یعنی مشرکین کی طرح داڑھی مت منڈاؤ، مونچھیں کتراؤ اور داڑھی بڑھاؤ، الفاظ حدیث عبارت النص اور اشارۃ النص کے طور پر ثابت کرتے ہیں کہ مشرکین داڑھی صاف کرتے اور بڑی بڑی مونچھیں رکھا کرتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مشابہت کرنے سے منع فرمایا، تاکہ انبیائے کرام کی سنت متوارثہ کا قیام اور پیروی ہو سکے،، داڑھی شعائر اسلام میں سے ہے تمام انبیاء، مرسلین، تمام صحابہ، تابعین اور علماء ربانیین کی سنت مستمرہ ہے، داڑھی اور مونچھوں کے عنوان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! ''انھکوا الشوارب واعفوا اللحی'' (بخاری، ۲، ۸۷۵)

مونچھوں کو انتہائی درجے تک کاٹ کر پست کرو، اور داڑھیوں کو بڑھاؤ،،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ اقدس میں مجوسی بھی اسی عمل پر کاربند تھے، مشرکین کی طرح مجوسی بھی لمبی لمبی مونچھیں رکھتے اور داڑھی منڈواتے تھے، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

"جزو الشواب وارخوا اللحی وخالفوا المجوس" (مسلم)

مونچھیں کٹاؤ، اور داڑھیوں کو بڑھاؤ اور مجوسیوں کی مخالفت کرو،،

احادیث مبارکہ کا شان ورود، اور پس منظر، مشرکین اور مجوسیوں کی عملی اور صوری مخالفت ہے اور یہ مخالفت فطری ہے، مشرکین اور مجوسی داڑھی منڈا کر، اور مونچھیں بڑھا کر خلاف فطرت عمل کرتے تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اتباع فطرت اور پاسداری سنت انبیاء اور مرسلین کی تعلیم دی اور تاکید فرمائی،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریش مبارک گھنی تھی، آپ ریش مبارک کو بالکل نہیں کترواتے تھے مگر گاہے گاہے جو بال مبارک زائد ہوتے ان کو کتروا دیتے تھے،،

عمرو بن شعیب اپنے والد/ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: "ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یأخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا رواہ الترمذی"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ریش مبارک کے طول اور عرض میں جو بال لمبے ہوتے ان کو کاٹ دیا کرتے تھے، تاکہ صورت مبارک بدنما معلوم نہ ہو چونکہ یہ تمام انبیاء اور مرسلین کی سنت تھی اس لئے اس کے حسن کو باقی رکھنے کیلئے زائد بالوں کو کاٹ دیا کرتے تھے، پھر اللہ وحدہ لاشریک خود جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "قال ان اللہ تعالی جمیل یحب الجمال" (مسلم، مشکوۃ، ۴۳۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! بے شک اللہ جمیل ہے اور حسن و جمال کو محبوب رکھتا ہے،،

مقام غور

جمال صوری اہمیت کا حامل ہے، جمال صوزی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے جمال صوری کے اجزاء میں ریش کو تقدم اور اولیت حاصل ہے، غور طلب امر یہ ہے کہ مونچھیں کٹوانے اور داڑھی

بڑھانے والی حدیث ''احفو الشوارب واعفوا اللحی ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے

لیکن ان کا اپنا ذاتی عمل قبضہ سے زائد داڑھی کاٹنے کا ہے ،امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ :''وکان ابن عمر اذاحج اواعتمر قبض علی لحیته فما فضل اخذہ''(بخاری،۲،۸۷۵)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عادت تھی کہ جب آپ حج کرتے یا عمرہ تو قبضہ (مٹھ) سے زائد داڑھی کاٹ دیتے تھے،،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی عمل تھا، المصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:''انه کان یقبض علی لحیته فیاخذ مافضل عن القبضة'' کہ آپ ''مٹھ'' قبضہ سے زائد داڑھی کاٹ دیتے،،

اگر اعفوا اللحی کا حکم اور لفظی، معنوی تعبیر وتشریح زائد از قبضہ کو لازم اور واجب ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کیلئے زائد از قبضہ داڑھی کا کاٹنا ممکن نہ ہوتا، ہر دو جلیل القدر عالم صحابہ کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ زائد از قبضہ داڑھی کا رکھنا وجوب کا حکم نہیں رکھتا ،اور نہ ہی تاکید سنت کے زمرہ میں آتا ہے اسی لئے صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے فرمایا:''ان القدر المسنون ھو القبضة'' کہ سنت کے مطابق داڑھی صرف ایک قبضہ یعنی مٹھ ہے،،

امام طیبی علیہ الرحمہ نے فرمایا:''ھذا لا ینافی فی قوله اعفوا اللحی، لان المنھی عنه قصھا کفعل الا عاجم واخذ قلیل اطراف وطول لیس من القص''(قوت المغتذی ،ترمذی،۵۶۵)

دائیں بائیں کے اطراف ،اور طول سے قبضہ سے زاء داڑھی کے بالوں کو کاٹنا قص یعنی مونڈنا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عجمیوں کے فعل مونڈنے سے منع فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ اعفاء کا معنی بلاتحدید داڑھی کو چھوڑ دینا، لمبا کرنا نہیں، بلکہ نہ مونڈنا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا

جواس حدیث کے راوی ہیں اپنی ہی روایت کردہ حدیث کے خلاف کرنا، حکم حدیث کے منسوخ ہونے کو ظاہر کرتا ہے، اگر منسوخ تصور نہ کیا جائے تو پھر اعفاء کا معنی، بلا حد داڑھی کا رکھنا ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حد مقرر نہیں فرمائی، لیکن سوچنا ہوگا حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے جو حد مقرر فرمائی کس اصول کے تحت ہے؟ ان جلیل القدر صحابہ کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے برعکس ہرگز نہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسا راوی خود اپنی ہی روایت کے خلاف کرے جس سے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تصادم لازم آرہا ہو، تدبر و تفکر،

جیسا کہ مشرکین اور مجوسی کیا کرتے تھے، العرف الشذی نے فرمایا: "ناقل مافی الباب ان لم یحمل علی النسخ کماھو اصلنا فی عمل الراوی علی خلاف مرویہ مع انہ روی عن غیر الراوی وعن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یحمل الاعفاء علی اعفائھا من ان یاخذ غالبھا او کلھا کماھو فعل الاعاجم وغیرھم" (ترمذی، ۵۶۵)

ترجمہ: اعفاء لحیہ کے عنوان میں ہماری دلیل قبضہ داڑھی کیلئے نسخ ہے یعنی طویل لحیہ کا حکم منسوخ ہے اور اعفاء کا معنی قبضہ داڑھی ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی ہی روایت کے خلاف کیا ہے اگر اعفاء لحیہ مطلق ہوتا تو ایسا نہ کرتے،،

مزید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ اور راویوں نے بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ پوری داڑھی نہ منڈواؤ، اور نہ چھوٹی کرو، جس طرح عجمی لوگ، مشرکین اور مجوسی کرتے تھے،

امام بخاری رحمہ اللہ نے داڑھی بڑھانے اور مونچھوں کو کٹوانے میں حدیث: "خالفوا المشرکین وفروا اللحی واحفوا الشوارب"، نقل فرمائی ہے الفاظ حدیث کا مجموعہ تین جملے ہیں، ہر جملہ انشائیہ اور انفرادیت کا حامل ہے، لیکن پہلا جملہ خالفوا المشرکین، ہے اور

دوسرا جملہ وفروا اللحی ہے، ہر دو جملوں کا معنوی اور حکمی ربط دلالت کر رہا ہے کہ مشرکین کی مخالفت کا مدار دو صورتوں میں ممکن ہے،

۱: داڑھی مت مونڈو، کیونکہ مشرکین داڑھی بالکل صاف کرتے تھے،،

۲: داڑھی مت کتراؤ، مشرکین داڑھی کترا کر چھوٹی کرتے تھے، امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: "فانھم کانوا یقصون لحاھم ومنھم من کان یحلقھا" (حاشیہ بخاری، ۸۷۵)

مشرکین کا عمل دو قسم کا تھا کچھ داڑھی کتراتے اور کچھ داڑھی مونڈتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں طرح کے عمل سے منع فرمایا، کہ داڑھی مت مونڈو، اور مت چھوٹی رکھو،

عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے قبضہ داڑھی کو کاٹ کر اعفاء لحیہ کی تفسیر فرمائی ، اور داڑھی کے حکم میں حد مقرر فرمائی جو واجب العمل ہے،

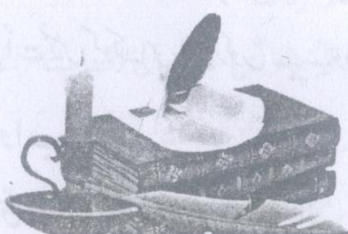
ابو زبیر حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ: "کنا نعفی السبال الا فی حج او عمرۃ" (ابوداود، ۲۲۵)

ہم داڑھی کے اگلے حصے کو جو سینہ پر ہوتا حج اور عمرہ کے موسم میں کاٹ دیا کرتے تھے،، ثابت ہوا مطلقا لمبی داڑھی رکھنے کے خلاف صحابہ کا عمل موجود ہے اور قبضہ سے زائد داڑھی کاٹنے پر بھی صحابہ کا عمل موجود ہے،

حدیث: "اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم" (مشکوۃ، ۵۵۴) کے تحت زائد از قبضہ داڑھی کا کاٹنا راہ ہدایت ہے کیونکہ اس پر عمل صحابہ کی مہر تائید و توثیق موجود ہے فقہائے کرام نے "واعفوا اللحی" کا مفہوم اور حکم قبضہ داڑھی لیا ہے اور جمہور امت اسی پر عمل پیرا ہے،، اللہ تعالی عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز جنازہ
میں قرأت نہیں



تحقیق

محقق دوراں
استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

نماز جنازہ میں قرأت نہیں

میت پر پڑھی جانے والی نماز کو مجازی طور پر نماز کہا جاتا ہے، باوجودیکہ اس میں رکوع ہے نہ سجدہ، میت کیلئے دعا کرنے کیلئے جو مخصوص ہیئت اور کیفیت اپنائی جاتی ہے اس کو نماز جنازہ کہا جاتا ہے نماز جناز میں ،نماز کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، بخاری میں ہے ''سماها صلوة ليس فيه ركوع ولا سجود ولا يتكلم فيها'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میت کی دعائے مغفرت کیلئے جو ماحول اور کیفیت پیدا کی جاتی ہے اس کو نماز کا نام دیا ہے، حالانکہ اس میں رکوع اور سجود نہیں ،اور نہ ہی اس میں کلام کی جاتی ہے، ''وفيها تكبير وتسليم'' (ج،۱،۱۷۶) اس میں تکبیر ہے اور سلام پھیرنا ہے،،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ نماز جنازہ میں تکبیر تحریمہ اور دونوں طرف سلام پھیرنا ہے ثابت کرتا ہے کہ نماز جنازہ میں قرأت نہیں کیونکہ اس میں رکوع ہے نہ سجود،،

ایک سوال اور اس کا جواب

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرء على الجنازة بفاتحة الكتاب، رواه الترمذی، وابو دائود، وابن ماجه)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھی ہے،

اس حدیث سے نماز جنازہ میں مرفوعاً سورۂ فاتحہ (قرأت) کا پڑھنا ثابت ہے،،

جواب نمبر ۱: ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے فرمایا: ''مع عدم تعيين دلالته على ان القرأة كانت على الميت اوفى الصلوة عليه، وبعد ای تكبيرة من تكبيراتها ،الحديث ضعيف لايصح الاستدلال به،، (مرقات، ج، ۴، ص، ۵۹)

۱: حدیث میں اس بات کی کوئی تصریح اور دلالت نہیں کہ سورۂ فاتحہ میت پر پڑھی ہے یا نماز جنازہ

میں پڑھی ہے،

۲: پھر چار تکبیروں میں سے کس تکبیر کے بعد پڑھی ہے؟ یہ حدیث ضعیف ہے قابل استدلال نہیں مبہم ہونے کیوجہ سے محتاج بیان ہے اس کا کوئی بیان نہیں،،

جواب نمبر ۲: ''قال میرک یشیر الی ان فی سندہ اباشیبة ابراھیم بن عثمان الواسطی وھو ضعیف منکر الحدیث'' (مرقات، ج، ۴، ۵۹)

محدث میرک نے فرمایا اس کی سند میں ابوشیبہ ابراھیم بن عثمان الواسطی ہے یہ شخص ضعیف اور منکر الحدیث ہے لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے،،

جواب نمبر ۳: ''قال میرک ولفظہ عن طلحة بن عبد اللہ بن عوف قال صلیت علی الجنازة مع ابن عباس قرء بفاتحة الکتاب فقال انھا من السنة فنسبه الحدیث مرفوعا الی ابی دائود غیر صحیح'' (مرقات، ۴، ۵۹)

محدث میرک نے کہا قرأت فاتحہ پر طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے مروی ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما،، کے ساتھ میں نے ایک میت کی نماز جنازہ پڑھی اس میں انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور پھر کہا کہ یہ ایک اچھا طریقہ ہے، اس حدیث کی روشنی میں یہ کہنا کہ ابوداؤد کے نزدیک بھی فاتحہ پڑھنے والی حدیث مرفوع ہے، غلط ہے صحیح نہیں، کیونکہ سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کو اچھا طریقہ کہنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا قول ہے، ثابت ہوا، نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے والی حدیث مرفوع نہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں فاتحہ کا پڑھنا سنت نبویہ نہیں، اگر ہوتی تو عبداللہ بن عوف کو علم ہوتا، از راہ تعجب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کیوں سوال کرتے؟

جواب نمبر ۴: امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی نماز جنازہ میں قرأۃ فاتحہ پر جو حدیث نقل کی ہے وہ مرفوع نہیں بلکہ ضعیف ہے اسی عنوان پر حضرت

طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے مروی ابوداؤد کی روایت میں ''فقال انھا من السنۃ'' کے الفاظ ہیں اور بخاری کی حدیث میں ''فقال لتعلموا انھا سنۃ'' ہے اس پر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''یعنی'' ان الفاتحۃ لو قرأت مکان الثناء لقامت مقام السنۃ'' (مرقات، ۴،۷۴)

انھا من السنۃ کا مقصد یہ ہے کہ اگر نماز جنازہ میں ''ثناء،، کی جگہ سورۂ فاتحہ کو پڑھا جائے تو یہ سنت کے قائم مقام ہوگا، یعنی سبحانک اللھم الخ کی جگہ پڑھنے سے سنت ادا ہو جائے گی، حدیث طلحہ اور بخاری میں واقع یہ جملہ ''لتعلموا انھا سنۃ'' ثابت کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث بخاری مرفوع نہیں، حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ

''ان ابن عمر لا یقرءھا فی الصلوۃ علی الجنازۃ'' (مؤطا امام مالک، مرقاۃ، ۴،۷۴) بے شک عبداللہ بن عمر نماز جنازہ میں قرأت نہیں کرتے تھے،،

جواب نمبر ۵: نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں،

ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے فرمایا: ''لم تثبت القرأۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا قرأت کرنا ثابت نہیں،،

شارح بخاری علامہ بدرالدین العینی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لیس فی صلوۃ الجنازۃ قرأۃ القرآن عندنا'' ''ہمارے نزدیک نماز جنازہ میں تلاوت قرآن نہیں ہے،،

مزید نقل فرمایا: ''وقال ابن بطال: وممن کان لا یقرء فی الصلوۃ علی الجنازۃ وینکر عمر بن الخطاب وعلی ابن ابی طالب وابن عمر وابوھریرۃ، ومن التابعین، عطاء وطاؤس، وسعید ابن المسیب وابن سیرین وسعید بن جبیر، والشعبی والحکم وقال ابن المنذر، وبہ قال مجاھد وحماد، الثوری، وقال مالک قرأۃ الفاتحۃ لیست معمولا بھا فی بلدنا فی صلوۃ الجنازۃ'' (العینی، جز، ۸، ۱۳۹)

ابن بطال رحمہ اللہ نے فرمایا: جو صحابہ نماز جنازہ میں قرأۃ نہیں کرتے تھے اور قرأۃ کا انکار فرماتے تھے ان میں عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ، خاص طور پر اور تابعین میں سے عطاء، طاؤس، سعید ابن المسیب، ابن سیرین، سعید بن جبیر، الشعبی، حکم، ابن المنذر، مجاہد، حماد، ثوری، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں،،

لیکن امام مالک نے فرمایا ہمارے شہر (مدینہ منورہ) میں نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا کوئی معمول نہیں، ثابت ہوا امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک نماز جنازہ میں قرأت نہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "لم یوقت فیھا النبی ﷺ قولا ولا قرأۃ ،ولان مالا رکوع فیہ لاقرأۃ فیہ کسجود التلاوۃ" رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ یا دیگر سورت کے پڑھنے پر نہ قولاً حکم فرمایا ہے اور نہ عملاً،،

دوسری بات یہ ہے کہ جس نماز میں رکوع نہیں اس میں قرأت بھی نہیں، جیسے سجدہ تلاوت، نماز جنازہ میں فاتحہ کے پڑھنے پر آثار بھی واقع ہوئے ہیں، لیکن ان حضرات کا پڑھنا دعا کی نیت سے تھا، قرأت کی نیت اور ارادے سے نہ تھا، علامہ عینی نے نقل فرمایا: "لعل قرأۃ من قرء الفاتحۃ من الصحابۃ کان علی وجہ الدعاء لا علی وجہ القرأۃ" (العینی، ۱۴۱، ۸)

'جن صحابہ نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کو پڑھا ہے شاید انہوں نے دعا کی نیت سے پڑھا ہو، قرأت کی نیت اور قرأۃ کے طریقہ پر نہ پڑھا ہو،،

جواب نمبر ۶: امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی جو حدیث نقل کی ہے پہلے گزر چکا ہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث مرفوع نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا کوئی ثبوت نہ عمل کے طور پر موجود ہے اور نہ فرمان کے طور پر،، امام ترمذی رحمہ اللہ نے تحقیقی نقطۂ نظر سے امام بخاری کی نقل فرمودہ حدیث کو نہ صرف مرفوع بلکہ صحیح ماننے سے بھی انکار کر دیا ہے، فرمایا: حدیث ابن عباس حدیث "لیس اسنادہ بذالک القوی" (۳۱۵)

حدیث عبداللہ بن عباس ضعیف ہے، کیونکہ ابراہیم بن عثمان، یہ ابوشیبہ الواسطی ہے اور یہ منکر الحدیث ہے، ثابت ہوا امام بخاری رحمہ اللہ نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے پر جو حدیث نقل کی ہے وہ ضعیف اور منکر ہے قابل استدلال نہیں،،

امام ترمذی نے فرمایا: "والصحیح عن ابن عباس قوله من السنة القرأة علی الجنازة بفاتحة الکتاب یعنی ابن عباس کا یہ کہنا کہ: نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا سنت یعنی اچھا طرز عمل ہے یعنی یہ جملہ عبداللہ بن عباس کا ہے یہ ان کا مقولہ ہے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں، کیونکہ اس کی تائید حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے بھی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ انها من السنة" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مقولہ ہے جو انہوں نے عبداللہ بن عوف کے قرأت فاتحہ کے سوال کرنے پر ارشاد فرمایا،،

ایک سوال اور اس کا جواب: صحابی کا یہ کہنا کہ من السنة، حدیث مرفوع ہے جیسا کہ اصول حدیث کی مشہور کتاب "تقریب النواوی میں ہے، قول الصحابی.........من السنة کذا...... کله مرفوع علی الصحیح،، ص، ۱۶۰) لہٰذا نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حدیث مرفوع سے ثابت ہے،

جواب اس کے دو جواب ہیں، (۱) وقیل لیس بمرفوع، صحابی اگر ایسا کہے تو وہ حدیث مرفوع نہیں ہوتی، (۲) صحابی کا ایسا قول، ہر مقام پر حدیث مرفوع نہیں ہوتا بلکہ اس کا اپنا اجتہاد ہوتا ہے،

محدث ابن دقیق العید نے فرمایا: ابن قلابہ کا قول "من السنة "یقتضی ان یکون مرفوعا بطریق اجتهادی محتمل من السنة""، مرفوع حدیث ہے لیکن یہ رفع اجتہادی ہے،،، مرفوع اجتہادی کا مقصد یہ ہے کہ یہ قول صحابی کا ہے، صحابی کی اپنی رائے اور ذاتی اجتہاد ہے، یعنی نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل ہونے کی وجہ سے حدیث ہے لیکن اس پر حدیث مرفوع کی تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں،،

امام شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا: "ربما یجد لفظ السنة من الصحابی ولکنه لایکون المذکور تحته مرفوعا بل استنباطه واجتهاده" (حاشیہ ترمذی، ص، ۳۲۵)

بسا اوقات صحابی من السنۃ، کا لفظ کہتا ہے لیکن اس کے تحت حکم مرفوع نہیں ہوتا بلکہ صحابی کا اپنا استنباط اور اجتہاد ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ کہنا کہ انھا من السنۃ ان کا اپنا اجتہاد اور استنباط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا نہ قولا ثابت ہے اور نہ عملا جیسا کہ پہلے نقل ہو چکا ہے مزید اگر من السنۃ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہوتی تو صحابہ کرام اور تابعین کا ہرگز اس میں اختلاف ہوتا نہ انکار،،

امام ترمذی نے فرمایا بعض صحابہ جو علماء راسخین تھے، "لا یقرء فی الصلوة علی الجنازة انما هو الثناء علی الله والصلوة علی نبیه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والدعاء للمیت"، (ترمذی، ۳۱۵)

وہ نماز جنازہ میں قرأت یا سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ نماز جنازہ اللہ تعالیٰ کی ثناء اور اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنے اور میت کیلئے دعائے مغفرت کرنے کا نام ہے،،

امام بخاری علیہ الرحمہ نے یہی فرمایا ہے: "فیھا تکبیر وتسلیم" کہ نماز جنازہ میں تکبیر/تکبیرات اور سلام پھیرنا ہے، لہذا: "لا صلوة الا بفاتحة لکتاب،، "کا حکم نماز جنازہ کیلئے نہیں کیونکہ اس میں رکوع ہے نہ سجود نماز جنازہ کے طریق ادائیگی اور ہیئت صوری کی بناء پر مجازا صلوۃ کہا گیا ہے،

ایک سوال اور اس کا جواب

امام بخاری علیہ الرحمہ نے نقل فرمایا: "وقال الحسن یقرء علی الطفل بفاتحة الکتاب ویقول اللهم اجعله لنا فرطا وسلفا واجرا"" (بخاری، ۱، ۱۷۸)

خواجہ حسن بصری بچے کی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے اور یہ دعا بھی پڑھتے تھے،،

خواجہ حسن بصری تابعی ہیں ان کا عمل حجت نہیں، کیونکہ ایک تو سورہ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں، دوسرا یہ کہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نماز جنازہ میں

قرأت کرنے کی مخالف اور منکر ہے، فرد کے مقابل اکثریت کا قول اور فعل راجح اور حجت ہے ،ان کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ہوئی آپ نے ہی ان کو گھٹی دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے، اسی لئے ان کا عمل راجح ہے اور حضرت حسن بصری کا عمل مرجوح ہے تیسرا یہ کہ وہ بچے کی نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے ساتھ بچے کی دعا بھی پڑھتے تھے اس طرح خواجہ حسن بصری تیسری تکبیر کے بعد پڑھتے تھے، جبکہ دیگر آثار میں آیا ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائلین ،پہلی تکبیر کے بعد پڑھتے تھے ،جیسا کہ علامہ عینی شارح بخاری رحمہ اللہ نے ''العینی'' میں تفصیلی ذکر فرمایا ہے،، اس طرح مقام قرأت بھی مختلف فیہ ہے، اختلاف کی صورت میں راجح اور مرجوح نہ ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ''فافہم'' اتفاقی عمل نہ ہونے کی وجہ سے خواجہ حسن بصری کی روایت قابل عمل نہیں ،،لہٰذا حدیث عبداللہ بن عباس کی طرح یہ حدیث بھی قابل استدلال نہیں،،

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب میت کی نماز جنازہ پڑھتے تو یہ دعا پڑھتے ،''اذا صلی علی الجنازۃ قال اللھم اغفر لحینا و میتنا و شاھدنا و غائبنا الخ'' اس کے علاوہ اور بھی دعائیں ہیں جو آپ نے پڑھی ہیں۔ لیکن سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ثابت نہیں،،

تائید مزید

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت امام مالک نے فرمایا کہ:''وقرأۃ الفاتحۃ لیست معمولا بھا فی بلدنا فی صلوۃ الجنازۃ'' (العینی ،جز ۸، ۱۳۹)

مدینہ منورہ میں نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا عمل موجود نہیں ،یعنی مدینہ منورہ میں نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ، قرأت نہیں کی جاتی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں،،

امام مالک رحمہ اللہ، ۱۰۳ھ میں پیدا ہوئے، واقدی کے بقول، ۱۷۸ھ میں داعی اجل کولبیک کہا، (مقدمہ مرقات، ۱۹،)

امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں دوقول ہیں، (۱) تابعی ہیں، (۲) تبع تابعین، میں سے ہیں، آپ کوامام الحجاز، اورامام الناس کہا گیا،

آپ نے تین سوتابعین اور چارسوتبع تابعین سے فقہہ اورحدیث کی تعلیم حاصل کی، (مرقات، ۱۹)

آپ کی جلالت علمی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداوٗد، امام ترمذی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے شیوخ میں معن بن عیسیٰ، یحییٰ بن یحیٰ، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی، عبداللہ بن وہب وغیرہ مشہور ہیں، اور ان حضرات کے شیخ حضرت امام مالک رحمہ اللہ ہیں، اس طرح آئمہ صحاح (چار آئمہ مذکورہ) کے شیخ الشیوخ حضرت امام مالک رحمہ اللہ ہیں، جن کوعلم، زمانہ، قدرومنزلت کے لحاظ سے تقدم اور شرف حاصل ہے، ان کا قول اس امر کی دلیل ہے کہ حرمین شریفین میں نماز جنازہ میں قرأت فاتحہ/قرأت کا عمل موجودنہیں اور یہ عمل قرأت امام مالک رحمہ اللہ کے دور سے لے کر آج تک حرمین شریفین میں ناپید اور متروک ہے، یہی وجہ ہے کہ حرمین شریفین میں ہرنماز کے بعد متعدد جنازے پڑھائے جاتے ہیں مگر سورۂ فاتحہ یا دوسری کسی آیت کی قرأت نہیں کی جاتی، خلاصہء بحث یہ ہے کہ نماز جنازہ میں قرأت نہیں،، "واللہ علیم خبیر"

تحقیق

محقق دراں استاذ العلماء والفضلاء قاضی محمد عظیم نقشبندی فاروقی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

''فتویٰ کون دے سکتا ہے؟''

دور حاضر میں علمائے دین کی قلت اور جہلاء کی بہتات اور کثرت ہے جو علماء کا روپ دھار کر محراب و ممبر کے وارث بن گئے ہیں، دینی علوم کے تعلیم و تعلم سے دور، تفقہ فی الدین کے شرف سے محروم، علمائے حقہ کی مجالس و معیت سے متنفر، ذوق جہالت سے مخمور، انانیت کے جبہ و دستار میں ملبوس منزل آز و حرص کی جانب رواں دواں ہیں، وجاہت شخصی، شوکت ذاتی کے قیام و بقاء میں اپنی جاہلانہ اور سوقیانہ زبان و کلام کو نص قطعی کا درجہ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے، تحکمانہ انداز تخاطب میں جس کو چاہیں من مانی تفسیرات الحاد اور تاویلات کا لیبل لگا کر کفر کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں، قرآن و حدیث کی تصریحات سے نا آشنا یہ لوگ امت کے علماء و فقہاء کے وضع کردہ اصول و قواعد دربارۂ فتوی سے بھی غافل اور جاہل ہیں، لاعلمی کی شاہراہ پر چلنے والے یہ مسافر بے راہ رو ہیں، پوری دنیا میں صدیوں سے تحقیق و تدقیق کا اجالا ہے، دین اسلام کا نور پوری آب و تاب کے ساتھ کائنات ارضی کے ذرے ذرے کو منور اور مستنیر فرما رہا ہے ہر مسلمان کا گھر اس نور سے تابندہ اور زندہ ہے، میڈیا اپنی زبان میں رشد و ہدایت کا پیغام نشر کر رہا ہے آج اس علم بھری دنیا میں جہالت کا کوئی حامی اور ناصر نہیں،،

بندۂ گنہگار! اہل علم مفتیان کرام کے حضور سلام عقیدت پیش کرتا ہے، ان کے فیضان عام اور درازی عمر کیلئے دعا گو ہے، بعض جہلاء کے فتاویٰ کو دیکھ اور سن کر حیرت کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ ''شرائط افتاء'' کو تحریر کیا جائے تا کہ معلوم ہو کہ فتویٰ دینا حقیقۃً مجتہد کا کام ہے اور مفتی کیلئے اجتہادی بصیرت کا ہونا ضروری ہے،، علامہ ابن عابدین علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''وقد استقر رأی الاصولین، علی ان المفتی هو المجتهد، فاما غیر المجتهد ممن یحفظ اقوال المجتهد فلیس بمفت'' (مقدمہ رد المختار، ص، ۶۹، فتح القدیر)

علمائے اصول کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مفتی صرف مجتہد ہے، اور جو مجتہد نہ ہو بلکہ مجتہد کے اقوال کا حافظ ، عالم ہو وہ مفتی نہیں،،

معلوم ہوا کہ مفتی کیلئے لازم ہے کہ اس میں اجتہادی بصیرت ہو، کیونکہ اس نے سائل کے سوال کا جواب کتاب وسنت ، اجماع اور قیاس کی روشنی میں دینا ہے ، اجتہادی بصیرت سے مراد ثقاہت علمی نہ ہے ، ثقاہت علمی علوم وفنون تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتی ہے ، کتاب وسنت اور فقہ کی تفہیم علوم وفنون کی دانست سے متعلق ہے ان کی تفہیم کے بعد آدمی عالم بنتا ہے ، جو شخص علوم وفنون کی تعلیم سے عاری اور نابلد ہے وہ عالم ہے نہ صاحب بصیرت ، جب صاحب بصیرت نہیں تو وہ مفتی کیسا؟ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا: ''فعرف ان مایکون فی زماننا من فتوی موجودین لیس بفتوی بل ھو نقل کلام المفتی لیاخذبہ المستفتی'' (ردالمختار، ص ۶۹)

پس معلوم ہوا کہ ہمارے زمانہ میں جو فتاوی موجود ہیں وہ درحقیقت فتاوی نہیں بلکہ وہ مجتہد کے کلام کی نقول ہیں ، جو مسائل کے جواب میں نقل کی جاتی ہیں،،

علامہ رحمہ اللہ کے کلام سے واضح ہوا کہ محقق ابن الہمام اور علامہ کے زمانے میں فتوی نویس حضرات مفتیان کرام نہیں بلکہ ناقلین ہیں،،

محقق ابن الہمام کا سن وفات ۶۸۱ھ اور علامہ ابن عابدین کی وفات ۱۲۵۲ھ میں ہوئی ہے جب چھٹی صدی ہجری میں مفتی نہیں تو پندرویں صدی ہجری میں کون مفتی ہے؟ جو اجتہادی بصیرت سے مسلح ہے ، چونکہ مفتی مجتہد نہیں بلکہ ناقل ہے تو ناقل ہونے کے حوالے سے

۲: مفتی پر لازم ہے کہ وہ اپنے زبانی اور تحریری فتوی میں آئمہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کا قول بطور حوالہ پیش کرے (مقدمہ ردالمختار، ۶۹)

مندرجہ اس شرط واضح ہو گیا کہ اگر کوئی شخص علمی وجاہت ، اجتہادی بصیرت ، سے محروم ہو، قول آئمہ راما م پیش کرے نہ کتب مشہورہ سے اقتباس نقل کرے تو وہ شخص مفتی ہے نہ فتوی دینے کا اہل ہے تو اس کا قول اور تحریر فتویٰ نہیں،

۳: فقہاء نے زور دیکر کہا ہے کہ نا اہل آدمی فتوی نہ دے، حاکم وقت ایسے شخص کو فتوی دینے سے روکے کہ ایسوں کے فتوی سے طرح، طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جس کا اس زمانے پر پورے طور پر مشاہدہ ہو رہا ہے، (عالمگیری)

ثابت ہوا نا اہل آدمی جو اجتہادی بصیرت سے محروم ہے اگر فتوی دے گا تو خرابی کا موجب ہوگا، عوام میں انتشار اور منافرت پیدا ہوگی اور اتحاد ملی پارہ پارہ ہو جائے گا، اور یہ مشاہداتی امر ہے،،

۴: مفتی پر لازم ہے کہ سوال کو پہلے غور سے سمجھے اس کے بعد جواب دے، (عالمگیری) یعنی پہلے سوال کی گہرائی میں اترے، جواب کا مقیس علیہ ادلہ ثلثہ میں تلاش کرے ھسوال اور جواب کا اشتراکی پہلو ملاحظہ کرے، ما بہ الاشتراک کو بنیاد بنا کر مسفتی کو جواب دے، مگر کسی سوال کے پیش ہوئے بغیر فتوی دینے کا مجاز نہیں، بوقت جواب، جواب میں،،

۵: مفتی پر لازم ہے کہ وہ مراتب آئمہ کو پیش نظر رکھ کر فتوی دے ترتیب آئمہ یہ ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ، امام الائمہ اور شیخ الائمہ ہیں، ان کا قول دیگر آئمہ کے اقوال پر مقدم ہے ان کے بعد حضرت امام ابو یوسف، اور پھر امام محمد، پھر امام زفر، اور حسن بن زیاد رحمھم اللہ کا مقام ہے ، ہاں اگر اصحاب فتوی اور اصحاب ترجیح نے امام اعظم رضی اللہ عنہ کے قول کے علاوہ کسی دیگر امام کے قول پر فتوی دیا ہو یا ترجیح دی ہو تو اس پر فتوی دینا بھی جائز ہے، طبقات فقہاء کی تمیز اور تفہیم بھی مفتی پر لازم ہے،،

۶: مفتی پر لازم ہے کہ جب تک مفتی کو اصحاب فقہ کی ترتیب اور فقاہت کا علم نہ ہو وہ فتوی دینے کا مجاز نہیں،،

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے رسم المفتی، کے عنوان میں فرمایا ہے "والفقهاء على سبع مراتب ،وقد اوضحها المحقق ابن كمال باشا في بعض رسائله فقال لا بد للمفتى ان يعلم حال من يفتى بقوله ولا يكفيه معرفته باسمه و نسبه بل لا بد من معرفته في الرواية و درجته في الدراية و طبقته من

طبقات الفقهاء لیکون علی بصیرة فی التمییز بین القائلین المحالفین و قدرة کافیة فی الترجیح بین القولین المتعارضین" (مقدمہ، ص، ۷۷)

فقہاء کرام کے سات طبقات ہیں، محقق ابن کمال پاشا نے اپنے ایک رسالہ میں اس کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ مفتی پر لازم ہے کہ جس فقیہ کے قول پر فتویٰ دے رہا ہے اس کے حال کا عالم ہو، اس کے نام ونسب کی معرفت کافی نہیں، بلکہ یہ معلوم ہو کہ روایت اور درایت میں اس کا مقام کیسا ہے؟ اور فقہاء کے کس طبقہ میں سے ہے، تا کہ اقوال مخالفہ کے امتیاز میں صاحب بصیرت ہو، اور اقوال متعارضہ کی صورت میں ایک قول کو ترجیح دینے کی قدرت کاملہ رکھتا ہو، فقہاء کے پہلے طبقے کا نام مجتہدین فی الشرع ہے، جیسے آئمہ اربعہ

آئمہ اربعہ رضی اللہ عنہم

پہلا طبقہ: زمانہ نبوت اور دور صحابہ وتابعین کے قرب کی وجہ سے اعتقاد وعمل کی بلندیوں پر فائز ہوئے، تعلیمات نبویہ، اور عملیات صحابہ وتابعین کے انوار سے مسلح ہو کر نور بصیرت کے اجالے میں ادلہ ثلاثہ (قرآن، حدیث، اجماع) کی گہرائیوں میں اترے غیر منصوص اور غیر واضح مسائل کی تحقیق اثبات، استخراج اور استنباط فرمایا، یہ پہلا طبقہ ہے اس طبقے کو، مجتہدین فی الشرع سے موسوم کیا گیا ہے، مذاہب اربعہ کی ایجاد و بنیاد انہی آئمہ اربعہ کی وجہ سے ہے،،

دوسرا طبقہ: مجتہدین فی المذہب کا ہے یعنی وہ فقہاء جنہوں نے مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں جلالت علمی اور شوکت فکری کو بروئے کار لاتے ہوئے اجتہاد کیا ہو، جیسے حنفی مذہب میں امام ابو یوسف، امام محمد اور دیگر احناف جنہوں نے ان اصول وقواعد کی روشنی میں ادلہ ثلاثہ سے احکام، اور مسائل کا استخراج کیا ہے جو اصول وقواعد حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے متعین اور مقرر فرمائے تھے، اگر چہ بعض فروعی مسائل میں اپنے جلیل مرتب استاذ کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے،

فقہاء کا تیسرا طبقہ: مجتہدین فی المسائل کا ہے، اس طبقہ نے ان مسائل میں اجتہاد کیا ہے جن پر

صاحب مذہب کی کوئی واضح نص موجود نہ تھی ، ان فقہاء نے اصول وقواعد سے مدد لیتے ہوئے ،غیر واضح، غیر منصوص علیہا مسائل کو اجاگر کیا، ابہامات اور مجملات کو دور کر کے فقہ کا حصہ بنایا، ان میں امام خصاف ، امام ابی جعفر الطحاوی، امام ابی الحسن کرخی ، شمس الآئمہ السرخسی، فخر الاسلام ابزدوی، فخر الدین قاضیخان وغیرہم سرفہرست ہیں،

ان حضرات نے اصول وقواعد کی مخالفت نہیں کی ، نہ ہی مسائل فرعیہ میں اپنی راہ لی بلکہ ان احکامات کا استنباط کیا جو اصول وقواعد کے لحاظ سے غیر منصوص علیہا تھے،

چوتھا طبقہ اصحاب تخریج کا ہے: یہ مقلدین ہیں، یہ بالکل مجتہد نہیں تھے، اجتہادی قوت سے محروم تھے، لیکن چونکہ اصول وقواعد پر دسترس حاصل تھی، اور مسائل کے ماخذ کا علم رکھتے تھے اس لئے قول مجمل، ذی وجہین، حکم مجمل محتمل امرین کی تفصیل اور تشریح پر قادر تھے، یہ مسائل ہدایہ، تخریج کرخی اور تخریج رازی میں پائے جاتے ہیں،

پانچواں طبقہ اصحاب ترجیح کا ہے: یہ فقہاء مقلدین ہیں، ان کا کام تعدد روایات کی صورت میں ایک روایت کو ترجیح دینا اور قابل عمل بنانا ہے، جیسے ان کا فرمان: "هذا اولى، هذا اصح رواية، هذا اوفق للناس" ان میں ابی الحسن القدوری، اور صاب ہدایہ ہیں،

چھٹا طبقہ اصحاب تمیز کا ہے: یہ فقہاء قوی اقویٰ، قوی ضعیف، ظاہر مذہب، روایۃ نادرہ، کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسے متاخرین اصحاب متون، مثلاً صاحب کنز، صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب المجمع، یہ حضرات اپنے اپنے متون میں اقوال مردودہ اور روایات ضعیفہ کو بالکل نقل نہیں کرتے،

ساتواں طبقہ مقلدین کا ہے: یہ صرف تقلید کرتے ہیں، مذکورہ بالا امور میں سے کسی امر کی صلاحیت اور طاقت نہیں رکھتے، (ردالمختار، ا، ص، ۷۷)

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقہاء کا چوتھا طبقہ دولت اجتہاد سے محروم ہے، ان کے علم وعمل

کی جولانگاہ فقہائے متعدمین کی تحقیق واجتہاد ہے، جس میں ترمیم واضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ،محقق ابن الہمام رحمہ اللہ کا اعترافی بیان اس بارے میں دلیل کافی اور ثبوت شافی ہے کہ فقہائے چوتھے طبقے کیلئے ہر قسم کے اجتہاد کیلئے دروازہ مسدود ہے اسی لئے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے دور کے مفتیان کرام، ناقلین ہیں، مفتیان کرام نہیں، کیونکہ فقہاء کے چوتھے طبقے سے تیسرے طبقے والوں نے طاقت اجتہاد کو سلب کر رکھا ہے، محقق ابن الہمام نے یہ اعلان چھٹی صدی ہجری میں فرمایا، اعتراف حقیقت کرتے ہوئے خود بھی ناقلین میں شامل ہوئے، باوجودیکہ وہ اوصاف مجتہد سے مکمل اور پوری طرح متصف تھے، خاتم المحققین علامہ ابن عابدین حنفی رحمہ اللہ نے ردالمختار جلد ۳، ص، ۱۷۳، پر بحروف جلی اس کو نقل فرمایا ہے، کتب فقہ کے ملاحظہ سے تغلیباً یہ ثابت ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کا انجام اجتہاد کے سورج کے ختتام پر ہے، تسلیم کرنا ہوگا کہ مسائل کے نقل کی بنیاد اور رسم پرانی ہے، ناقلین کو مفتیان کرام کا نام اور لقب محض لغوی، عرفی، اور عادی ہے تحقیقی اصطلاحی نہیں، مسائل کا جواب نقل کرنے کیلئے ناقل کیلئے تبحر علمی کا ہونا ضروری ہے،

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا: "من کان لہ قوۃ ادراک لقوۃ المدرک یفتی بالقول القوی المدرک" (ردالمختار، ج، ۱، ص، ۷۱)

یعنی فتوی دینے والے کیلئے ضروری ہے کہ تفہیم مسائل میں اتنا طاقتور ہو کہ تجزیاتی عمل میں قول قوی کو اخذ کر سکے، کیونکہ مفتی قول قوی پر فتوی دینے کا پابند ہے، فقہاء متاخرین نے مفتی کیلئے اجرائے فتوی میں ہدایات جاری کرتے ہوئے فرمایا: "ان ما اتفق علیہ اصحابنا فی الروایات الظاہرۃ یفتی بہ وطعا" فقہائے احناف کا متفقہ فیصلہ ہے کہ روایات طاہرہ سے فتوی دیا جائے گا، (ردالمختار، ص، ۶۹)

روایات ظاہرہ کو مسائل الاصول بھی کہتے ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جو آئمہ مذہب، امام ابوحنفیہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر، امام حسن بن زیاد سے براہ راست مروی ہیں، اور ان کا ماخذ امام

ابو حنیفہ کی ذات گرامی ہے، امام محمد نے ان مسائل کو چھ کتب میں جمع فرمایا، جو مبسوط، الزیادات ،جامع صغیر، سیر صغیر، جامع کبیر، سیر کبیر کے نام سے مشہور ہیں،،

مسائل کی ایک اور قسم بھی ہے یہ مسائل آئمہ مذہب سے مروی ہیں مگر مذکورہ بالا کتب میں ان کا اندراج اور تذکرہ نہیں ان کو مسائل التوادر کہا جاتا ہے ان کا وجود اور ثبوت امام محمد کی کتب کیسانیات ،ہارونیات ،جرجانیات ،رقیات میں پایا جاتا ہے،ان مسائل کی جاع کتاب، امام ابو یوسف کی ''آمالی'' ہے،

مسائل کا تیسرا درجہ واقعات کے نام سے مشہور ہے یہ مجتہدین متاخرین کے استنباطات ہیں۔ان کے موجدین کی فہرست طویل ہے، ان مذکورہ بالا کتب سے فتوی دیا جاسکتا ہے،، (ردالمختار،۱،ص،۶۹)

جن کتب سے فتوی نہیں دیا جاسکتا وہ درج ذیل ہیں،

''نہر، شرح کنز العینی، درمختار شر تنویر الابصار، شرح کنز لملا مسکین، شرح النقایہ للقہسانی، القنیہ لزاہدی، '' (ردالمختار،۱،ص،۷۰)

(ضروری تنبیہ) علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے مفتی کیلئے ہدایات کے عنوان میں فرمایا:" اذا لم یکن المفتی مجتهدًا فهو صریح فی ان المجتهد یعنی من کان اهلا للنظر فی الدلیل یتبع من الاقوال ما کان اقوی دلیلا و الا فا التبع الترتیب السابق " (ردالمختار،۱،ص،۷۱)

ظاہر ہے مفتی مجتہد نہیں اگر اس کا پایۂ علمی راسخ ہے اور دلیل کی گہرائی اور اس کا وزن قائم کرنے کا اہل ہے جب فقہاء کے اقوال میں اختلاف ہو تو جو قول دلیل اقوی کی پیداوار ہے اس کو نقل کرے اور اگر دلیل کے ضعف اور قوت کی شناخت نہیں رکھتا تو سابقہ ترتیب کو بروئے کار لائے ،

سابقہ ترتیب کیا ہے؟ اذا کان ابو حنیفة فی جانب و صاحباه فی جانب فالمفتی بالخیار ،والاول اصح" (۷۰) اگر ایک مسئلہ میں تعارض ہو، امام ابو حنیفہ کا قول صاحبین کے قول سے معارض ہو تو کسی ایک قول پر فتوی دینا جائز ہے، لیکن اصح کیا ہے؟

کہ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتوی نقل کرے،،

ہدایات کی تفصیل اور ضمن میں علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا: ”قد جعل العلماء الفتوی علی قول الامام الاعظم فی العبادات مطلقاً و ھو الواقع بالاستقراء“ و قد صرحوا بان الفتوی علی قول محمد فی جمیع مسائل ذوی الارحام، و الفتوی علی قول ابی یوسف فیما یتعلق بالقضاء کما فی القنیة و البزازیة، وفی شرح البیری ان الفتوی علی قول ابی یوسف ایضاً فی الشهادات، وعلی قول زفر فی سبع عشرة مسالة جررتها فی رسالة وینبغی ان یکون ھذا عند عدم ذکر اھل المتون للتصحیح، والا فالحکم بما فی المتون کما لا یخفی لانها صارت متواترة، واذا فی مسئله قیاس واستحسان، فالعمل علی الاستحسان، وفی آخر المستصفی للامام النسفی، اذا ذکر فی المسلة ثلاث اقوال، فالراجح ھو الاول او الاخیر لا الوسط“ (ردالمختار، ا،ص،۱۷)

علماء کی تحقیق اور تفتیش کے مطابق عبادات میں مطلقاً فتوی امام اعظم رضی اللہ عنہ کے قول پر ہوگا،، علماء نے واضح کردیا ہے کہ ذوی الارحام کے تمام مسائل اور معاملات میں فتوی امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر ہوگا،، قضاء کے معاملات مس فتوی امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر ہوگا، جیسا کہ الاشباہ، والنظائر، قنیہ، بزازیہ نے فرمایا ہے، شرح البیری میں ہے کہ شہادات میں فتوی امام ابویوسف رحمہ اللہ کے قول پر ہوگا، اور سترہ مسائل میں فتوی امام زفر کے قول پر ہوگا، ان مسائل کیلئے علیحدہ رسالہ بھی تحریر کیا گیا ہے، لیکن یہ مسائل وہ ہیں جن کو اہل متون نے ذکر نہیں کیا بلکہ نظر شک سے دیکھا ہے ورنہ حکم انہی متون پر ہوگا، کیونکہ متون میں آمدہ اقوال کو تواتر صوری اور تواتر معنوی کا درجہ حاصل ہے اور جب کسی مسئلہ میں قیاس اور استحسان مقابل آجائیں تو عمل استحسان پر وگا، امام نسفی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب ”المستصفی“، کے اختتام پر فرمایا ہے اگر ایک مسئلہ میں تین اقوال مذکور ہوں تو قول راجح پہلا قول ہوگا یا قول آخیر، درمیانہ قول ساقط الاعتبار ہوگا،، اور اگر متون سے کسی قول کی تائید نہ ملے تو مفتی کو اختیار ہے جس قول پر چاہے فتوی دے،، (ص،۱۷)

مزید فرمایا: "انه اذا اختلف التصحیح، و الفتوی، فالعمل بما وافق المتون اولی، و کذا لو کان احدهما فی الشروح، والا خر فی الفتاوی لما صر حوا به ان ما فی المتون مقدم علی ما فی الشروح وما فی الشروح مقدم علی ما فی الفتاوی لکن هذا عند التصریح بتصحیح کل من القولین او عدم التصریح اصلا" (ردالمختار، ا،ص، ۷۲)

جب کسی مسئلہ میں ھوالصحیح اور الفتوی علیہ کا اختلاف ہوتو اب دونوں میں جومتون کے مطابق اور موافق ہووہ قابل عمل ہوگا، اسی طرح اگر ایک قول شروحات میں ہواور دوسرا قول فتاوی میں ہوتو قابل عمل وہ قول ہوگا جومتون میں ہے، اور اگر ایک قول پر ھوالصحیح کی مہر ہواور دوسرے قول کو اصحاب فتاوی نے نقل کیا ہوتو قابل عمل وہ قول ہے جومتون کی شروحات میں ہے لیکن یہ کلیہ اس وقت جاری ہوگا جب دونوں قول صریحا مذکور ہوں، یا بالکل مذکور نہ ہوں، اور اگر کسی واقع کی نسبت فتوی اور شروح میں کوئی قول موجود نہ ہولیکن فقہائے متاخرین نے ایک قول پر اتفاق رائے کرلیا ہوتو وہ قول قابل فتوی ہے پھر فرمایا:

"فان اختلفوا یو خذ بقول الا کثرین ثم الا کثرین مما اعتمد علیه الکبائر لمعروفون منهم ، کابی حفص ، ابی جعفر ، ابی اللیث، و الطحاوی، و غیرهم ممن یعتمد علیه "اگر ایک مسئلہ میں مشائخ متاخرین کا اختلاف ہوتو پھر اکثریت کے قول پر فتوی ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ اکثریت کے قول کو معروف کبار فقہاء کی حمایت اور تائید حاصل ہو، جیسے امام ابی حفص ،امام ابوجعفر، امام ابی اللیث، امام طحاوی،،

مفتی کیلئے لازم ہے کہ اس کو علامات فتویٰ کا علم ہو، کیونکہ فتوی کا ماخذ الفتی ہے، اور الفتی ھوالشباب القوی کو کہا جاتا ہے، یعنی طاقتور نوجوان وجہ مناسبت یہ ہے کہ "لان المفتی لقوی السائل بجواب حادثۃ" (ص:۷۲) کہ مفتی سائل کو پیش آنے والے مسئلے کا جواب مدلل، محقق دیکر تقویت پہنچاتا ہے، حاشیہ بزدوری میں ہے: "اما العلامات لافتاء فقوله وعلیه الفتوی ،وبه

یفتی، وبہ نأخذ وعلیہ الاعتماد ،وعلیہ عمل الیوم وعلیہ عمل الامۃ ،وھو الصحیح ،اوالاصح ،اوالاظھر اوالاشبہ ،اوالاوجہ ،اوالمختار ‘‘یعنی تمام الفاظ علامات فتوی ہیں ،یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے، کہ لفظ فتوی صحیح اصح اور اشبہ سے زیادہ طاقتور ہے،وبہ یفتی اکد من لالفظ الفتوی علیہ اصح اور صحیح سے اور احوط احتیاط سے زیادہ طاقتور ہے،،

مزید فرمایا:’’اذا تعارض اما مان معتبران عبر احدھما بالصحیح والاخر بالاصح فالاخذ بالصحیح اولی لانھا اتفقا علی انہ صحیح ،والاخذ بالمتفق ،اوفق‘‘ (۷۳) اگر دو معتبر امام کے اقوال باہم متعارض ہوں ایک نے صحیح کہا ہو،اور دوسرے نے اصح کا فتوی دیا ہو تو عمل صحیح پر کہا جائیگا کیونکہ جواب کے صحیح ہونے پر دونوں متفق ہیں،اور متفق پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے،،

اور اگر مشائخ متاخرین نے صراحتاً اس پر کوئی حکم صادر نہ فرمایا ہوتو:’’ینظر المفتی فیھا نظر تامل وتدبر واجتھاد لیجد فیھا مایقرب الی الخروج عن العھدۃ ولا یتکلم فیھا جزافا ویخشی اللہ تعالیٰ ویراقبہ فانہ امر عظیم لا یتجاسر علیہ الا کل جاھل شقی‘‘(۷۱) مفتی پر لازم ہے کہ سوال وجواب کو دقت نظر سے ملاحظہ کرے،غور وفکر اور اجتہاد کی گہرائیوں میں اترے،تاکہ مفتی ایسے حتمی اور تحقیقی نتیجہ پر پہنچے جو اس کو فرض منصبی کی ذمہ داری سے عہد برآ ہونے کے قریب کردے،لایعنی اور بے ثبوت امر کو فتوی نہ بنائے،خشیت الٰہی کو اپنے اوپر طاری کرے،اور اللہ تعالیٰ کے حضور مراقبہ کرے، کیونکہ فتوی ایک امر عظیم ہے،بے دھڑک لایعنی فتوی وہی دیتا ہے،جو جاہل ہو اور بد بخت ہو،،

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کی یہ ہدایت اس پر نص ہے کہ مفتی تحریر فتوی یا اجرائے فتوی سے قبل سوال کی نوعیت یا امر حادث کا بغور تحقیقی جائزہ لے،اور کسی بھی معاملہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھے بلکہ اس کے صحیح جواب کو اپنا فرض منصبی سمجھے اور اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے علمی اجتہادی

راہ اپنائے ،اللہ تعالٰی کسے خوف اورڈر کے اجالے میں صحیح جواب کیلئے اللہ کی بارگاہ میں استدعا کرے ،جاہل اور بد بخت شخص کی طرح فتوی لگانے میں عجلت سے کام نہ لے،فتوی دینا انبیاء کرام ،صحابہ ،تابعین ،آئمہ مجتہدین کی سنت اورطریقہ ہونے کے حوالے سے عظمتوں کا حامل ہے، جہالت اورشکاوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ،شریعت میں سب سے عمیق اوردقیق امرفتوی دینا ہے اسی لئے فقہاء متقدمین اورآئمہ مجتہدین نے فتوی دینے میں احتیاط کی حدوں کو چھوا ہے ،اورننانویں احتمالات کفر کے حامل شخص کو کافر کہنے سے بھی دریغ اور پرہیز کیا ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ مفتی کیلئے قوت اجتہادیہ اورتبحر علمی ضروری ہے،جندروئی ہونا ضروری نہیں، علم فقہ کی عین اورفاء سے جاہل اورنابلد لوگ فتوے جاری کریں تو یہ قیامت سے پہلے ایک اور قیامت ہے، مفتی کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے عرف اوران کی عادات سے باخبراور صاحب علم ہو جومرورزمانہ کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں کیونکہ لوگوں کا عرف اوران کی عادات اپنی تاثیرات اورحکم میں اسقدرحاوی اورغالب ہیں کہ ظاہر الروایار ایسی قوتیں بھی ان کے مقابل بے بس اورمنسوخ ہیں چنانچہ علام ابن عابدین رحمہ اللہ نے تنبیہ کے انداز میں فرمایا:''والفتوی علی العرف الحادث لان کلام کل عاقدو حالف ونحوہ یحمل علی عرفہ وان خالف ظاھر الروایات''لوگوں کے عرف جدید پرفتوی صادر کیا جائے گا ،ہر آدمی کے قول وعمل اورحلف کوعرف اورلوگوں کی عادات کے تناظر میں دیکھا جائے گا ،،اگر چہ عرف وعادات روایات ظاہر یہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں،،

لوگوں کی عادات اورعرف کا جاننا اور باخبر رہنا بھی مفتی کی ذمہ داری کا ایک اہم حصہ ہے جس سے واضح ہوا کہ عادات وعرف کے جوابات صادر کرنے کیلئے مفتی کیلئے علم بلیغ کا حامل ہونا ایک بنیادی شرط ہے ،کیونکہ ایسی صورت میں قیاس کا عمل کارفرما ہوگا،جس کا وجود اورصدوراجتہاد اورعلم راسخ کا مرہون منت ہے،،

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا:''کما قالوا من ان الحاکم اوالمفتی لیس لہ ان

یحکم او یفتی بظاھر الروایۃ ویترک العرف‘‘(ردالمختار، ۳، ۴۳۴)

اسی لئے فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حاکم ہو یا مفتی لوگوں کے عرف کو چھوڑ کر روایات ظاہرہ پر نہ فتوی دے گا نہ کوئی فیصلہ کرے گا، مقدمات ہوں یا سوالات کے جوابات یا فیصلہ جات، عرف کے تابع ہوں گے، محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے فرمایا:’’والحق ان علی المفتی ان ینظر فی خصوص الوقائع‘‘(ردالمختار، ۳، ۴۳۵)

حق اور صحیح بات یہی ہے کہ مفتی واقعات کی خصوصیات پر دقت نظر سے کام لے گا،، قرآن ،حدیث ،اجماع اور اقوال فقہاء میں تمثیلات تلاش کرے گا اور پھر فتوی صادر کرے گا یہ فتوی بالقیاس ہوگا، اور اگر تحقیقات اور نور اجتہاد سے مسلح ہو کر جواب دے گا تو فتوی بالتحقیق ہوگا، لیکن اس میں خطاء کا امکان بہر حال باقی رہے گا، اور جواب کے اختتام پر یہ عبارت تحریر کرے گا ’’واللہ اعلم بالصواب،، اور اگر تمثیلات میں یکجہتی اور مساوات ہو تو قول راجح اور دلیل ارجح کی تلاش میں سعیء بسیار کے بعد فتوی صادر کرے گا، تاکہ قول مرجوح سے بچا جا سکے، قول مرجوح پر فتوی دینا جہالت ہے اور نقض اجماع ہے،،

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے فرمایا:’’ان الحکم والفتیا بالقول المرجوح جھل وخرق للاجماع‘‘(ردالمختار، ۳، ۵۰۸)

مفتی کیلئے شریعت مطہرہ کی پاسداری ضروری ہے، فاسق، فاجر نہ ہو، اگر ایسا شخص مفتی بن گیا ہو یا کسی ذریعہ سے مفتی بنا دیا گیا ہو تو اس سے فتوی لینا اور متوی پوچھنا جائز نہیں، ’’المجمع‘‘ اور اس کی شرح میں ہے:’’لایصلح ان یکون مفتیا لانہ من امور المسلمین‘‘ فاسق فتوی دینے کا اہل نہیں،

کیونکہ فتوی مسلمانوں کے دینی امور کا نام ہے، دینی امور میں فاسق قابل شہادت نہیں، اس کی شہادت غیر معتبر اور غیر مقبول ہے اس لئے اس کا فتوی غیر مقبول اور لائق عمل نہیں،، (عینی، فتح القدیر)

''قال صدر الاسلام البزدوی اجمع العلماء علی ان المفتی یجیب ان یکون من اھل الاجتھاد فانہ یحتاج الی الاجتھاد لا محالۃ'' (عینی، فتح القدیر)

صدر الاسلام البزدوی رحمہ اللہ نے فرمایا: علماء اور قضاۃ کا اس بات پر اجماع ہے کہ مفتی کیلئے اہل اجتہاد سے ہونا واجب ہے، کیونکہ مفتی جواب دینے کیلئے اجتہاد کا محتاج ہے،

علامہ عینی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لانہ یجتھد کل الجھد فی اصابۃ الحق الی المستحق حذرا عن النسبۃ الی الخطاء'' کیونکہ مفتی اپنی تمام تر علمی اور اجتہادی قوتوں کو اس بات پر صرف کرتا ہے کہ سائل حق، اور محفوظ عن الخطاء امر سے بہرہ ور ہو'' (ہدایہ، فتح القدیر، ۷، ۲۳)

مفتی کو ہوشیار اور بیدار مغز ہونا چاہیے، غفلت برتنا اس کیلئے درست نہیں، کیونکہ اس زمانہ میں اکثر لوگ حیلہ سازی، اور ترکیبوں سے واقعات کی صورت بدل کر فتوی حاصل کرتے ہیں، اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فلاں مفتی نے ہمیں فتوی دے دیا ہے، محض فتوی ہاتھ میں ہونا ہی اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں بلکہ مخالف پر اس کی وجہ سے غالب آجاتے ہیں، اس فتوی کو کون دیکھے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اس نے سوال میں کیا ظاہر کیا''

(ردالمختار، بہار شریعت، ۱۲، ۲۸۸)

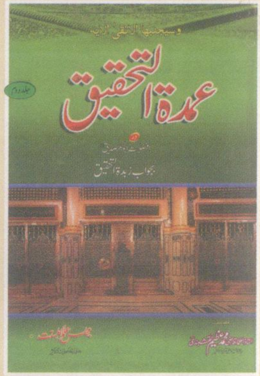
محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے فرمایا: ''واعلم ان ما ذکر فی المفتی فلا یفتی الا المجتھد'' (فتح القدیر، ۷، ص، ۷ ۲۳)

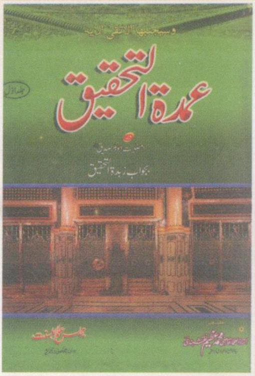
جان لو کہ مفتی کی شرائط وہی ہیں جو قاضی کی ہیں، جو مجتہد نہیں وہ مفتی نہیں ہوسکتا، یعنی جو شخص قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے مسائل اخذ اور استنباط نہیں کرسکتا وہ فتوی دینے کا اہل نہیں۔

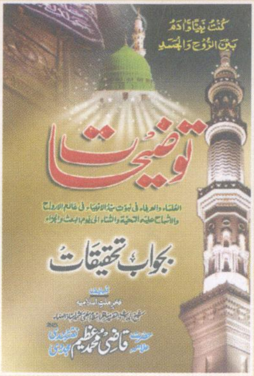
''وما توفیقی الا باللہ''

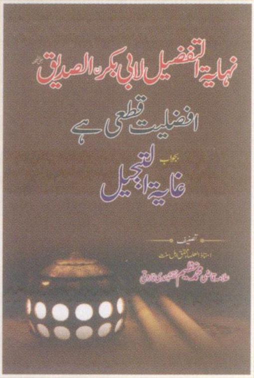
تحقیق: محقق دوراں استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی فاروقی

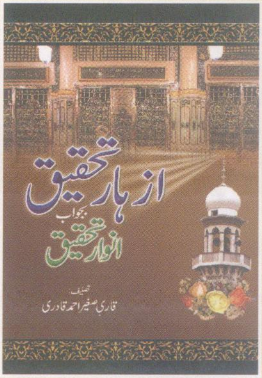
استاذ العلماء کی دیگر علمی تصانیف

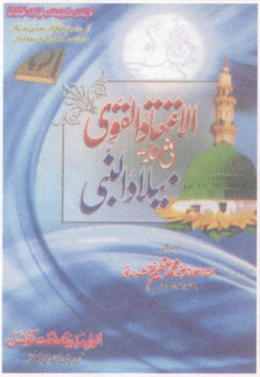


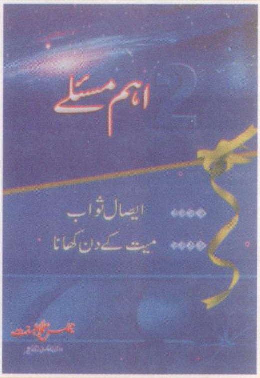


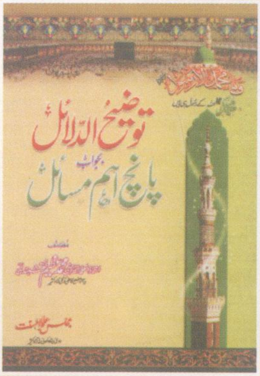












Printed by: AFS
+92 322-7202212

مجلس علماء اہلسنت
وادئ بناہ
کھوئی رٹہ آزاد کشمیر

0344-5751600, 0301-5802417, 0312-9537375
0343-1089012, 00447867790821